الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

سچا آغاز ہمیشہ سچے انجام پر ختم ہوتا ہے
اور جھوٹا آغاز ہمیشہ جھوٹے انجام پر

جنوری ۱۹۸۳ □ قیمت فی پرچہ — تین روپے □ شمارہ ۷۴

اسلامی مرکز کا ترجمان

الرسالہ

جنوری ۱۹۸۳
شمارہ ۷۴

جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دھلی ۱۱۰۰۰۶ (انڈیا)

مولانا وحید الدین خاں، صدر اسلامی مرکز نے نومبر ۱۹۸۲ میں حیدر آباد کا سفر کیا۔ اس سفر کی تفصیل روداد الرسالہ کے آئندہ کسی شمارہ میں آئے گی۔

اس دورہ میں مولانا موصوف کی متعدد تقریریں ہوئیں۔ مولانا نے اہل حیدر آباد کے سامنے اسلامی مرکز کے مشن اور اس کے طریق عمل کی بھی وضاحت کی۔ تمام تقریریں بہت دل چسپی سے سنی گئیں۔ تعلیم یافتہ افراد بڑی تعداد میں اجتماعات میں شریک ہوتے رہے۔

اس کے بعد لوگوں کے اصرار کے مطابق حیدر آباد میں اسلامی مرکز کی مقامی شاخ قائم کردی گئی۔ اس شاخ کا دفتر مندرجہ ذیل پتہ پر قائم ہے۔ مقامی لوگ اسلامی مرکز کے لئے یا اس کی مطبوعات حاصل کرنے کے لئے یہاں سے ربط فرمائیں۔

اسلامی مرکز۔ بیت المدینہ۔ سلطان پورہ۔ حیدر آباد ۲۴
فون نمبر 51793

زر تعاون سالانہ ۳۶ روپیہ • خصوصی تعاون سالانہ دو سو روپے • بیرونی ممالک سے ۱۲ ڈالر امریکی

دو قسم کی روحیں

قرآن کی سورہ نمبر ۹۱ میں ارشاد ہوا ہے: قد افلح من زکّٰھا وقد خاب من دسّٰھا (وہ شخص کامیاب رہا جس نے اپنے آپ کو پاک کیا اور وہ شخص برباد ہوگیا جس نے اپنے آپ کو گندا کیا) موجودہ زندگی آخرت سے پہلے کا ایک امتحانی موقع ہے۔ جو شخص یہاں سے نیک اور ستھری روح لے کر آخرت کی دنیا میں پہنچے گا وہ وہاں جنت کی پرمسرت فضاؤں میں بسایا جائے گا اور جو شخص یہاں سے برائیوں میں لپٹی ہوئی روح لے کر آخرت کی دنیا میں جائے گا اس کو وہاں جہنم کے پُرعذاب ماحول میں دھکیل دیا جائے گا۔

موجودہ دنیا گویا خدا کی نرسری ہے۔ نرسری میں مختلف قسم کے پودے اگائے جاتے ہیں ۔ زمین میں روئیدگی کی قوت بہت زیادہ ہے۔ چنانچہ یہاں طرح طرح کے پودے اگ آتے ہیں۔ مالی ان سب کی جانچ کرتا ہے۔ جو پودے غیر مطلوب پودے ہیں ان کو وہ کاٹ کر پھینک دیتا ہے۔ اور جو پودے اس کے مطلوب پودے ہیں ان کو اہتمام سے نکال کر لے جایا جاتا ہے تاکہ کسی باغ میں ان کو پھلنے پھولنے کے لئے نصب کر دیا جائے۔

موجودہ دنیا میں آدمی کے لئے بیک وقت دونوں مواقع کھلے ہوئے ہیں۔ وہ چاہے تو اپنی روح کو پاک کرے اور چاہے تو گندا کرتا رہے۔ کوئی وہ شخص ہے جو اللہ کی بڑائی کو مان کر اس کے آگے اپنے آپ کو جھکا دیتا ہے۔ اس کے سامنے جب کوئی حق آتا ہے تو وہ بے جھجھک اس کا اعتراف کر لیتا ہے۔ لوگوں سے معاملہ کرتے ہوئے وہ ہمیشہ خیرخواہی اور انصاف کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ دوستی ہو یا دشمنی ہر حال میں وہ خدا کی مرضی پر چلتا ہے نہ کہ اپنے نفس کی مرضی پر۔ یہ وہ شخص ہے جس نے اپنی روح کو پاک کیا۔ اس کو اس کا خدا جنت کی پُربہار دنیا میں بسائے گا۔

دوسرا آدمی وہ ہے جو خود اپنی بڑائی میں گم رہتا ہے۔ اس کے سامنے حق آتا ہے تو وہ اس کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ معاملات میں وہ سرکشی اور بے انصافی کا طریقہ اختیار کرتا ہے ۔ وہ اپنی مرضی پر چلتا ہے نہ کہ خدا کی مرضی پر۔ یہی وہ آدمی ہے جس نے اپنی روح کو گندا کیا۔ کائنات کا مالک اس کو اپنے پڑوس کے لئے قبول نہیں کرے گا۔ وہ اس کو جہنم میں دھکیل دے گا تاکہ وہ ابدی طور پر اپنے جرم کی سزا بھگتتا رہے۔

ہم کہاں ہیں

لعن الذین کفروا من بنی اسرائیل علیٰ لسان داؤد وعیسی ابن مریم ذلك بما عصوا وکانوا یعتدون ۔ کانوا لا یتناھون عن منکر فعلوہ لبئس ما کانوا یفعلون (المائدہ ۷۹ - ۷۸)

بنی اسرائیل میں سے جنھوں نے کفر کیا ان پر لعنت کی گئی داؤد اور عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے۔ یہ اس لئے کہ انھوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے گزر گئے تھے۔ وہ آپس میں ایک دوسرے کو برے کام سے روکتے نہ تھے جو وہ کر رہے تھے۔ کیسی بری روش تھی جو انھوں نے اختیار کی۔

یہود کی حیثیت قدیم زمانہ میں وہی تھی جو آج مسلمانوں کی ہے۔ اس اعتبار سے یہ آیت مسلم معاشرہ کے بارے میں خدا کے قانون کو بتا رہی ہے۔ اس کے مطابق مسلم معاشرہ کا حد سے گزرنا یہ ہے کہ اس کے افراد ایک دوسرے کو ستائیں اور ایک دوسرے پر زیادتی کرنے لگیں۔ ایسے وقت میں خدا کی طرف سے یہ فرض ہو جاتا ہے کہ جو شخص یہ دیکھے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو اپنے ظلم کا نشانہ بنا رہا ہے وہ فوراً اس کو روکنے کے لئے متحرک ہو جائے۔ کسی معاشرہ کے افراد میں اگر یہ روح ختم ہو جائے تو وہ مسلم معاشرہ خدا کی نظر میں ملعون ہے۔ اس پر خدا کی لعنت نازل ہوگی نہ کہ خدا کی رحمت۔

موجودہ مسلم معاشرہ کو دیکھئے تو آج اس کی حالت یہی ہو رہی ہے۔ ہر بستی اور ہر محلہ میں ہر روز ایسے واقعات ہو رہے ہیں کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو ستا رہا ہے۔ جس شخص کے پاس بھی کوئی پیسہ یا کوئی زور آ گیا ہے اس کا دماغ گھمنڈ کا کارخانہ بنا ہوا ہے۔ کسی مسلمان بھائی سے اگر اس کو معمولی شکایت بھی پہنچ جائے تو اس کو اس وقت تک تسکین نہیں ہوتی جب تک وہ اس مسلمان کو ذلیل نہ کرے۔ وہ اس کی بربادی کے لئے وہ سب کچھ کر ڈالتا ہے جو اس کے بس میں ہے۔

مسلم معاشرہ میں آج ہر جگہ اور ہر وقت یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ مگر کوئی کسی کو روکنے والا نہیں۔ کوئی کسی کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں۔ البتہ ہمارے یہاں ایسے لوگوں کی فوج تیار ہو گئی ہے جو مسلمانوں کی مظلومیت پر تقریریں کرنے اور مضامین لکھنے کو اپنا قیادتی پیشہ بنائے ہوئے ہے۔ مسلمانوں کی قومی مصیبت پر لفظی بیان دینے میں ہر ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانا چاہتا ہے۔ مگر مسلمانوں کی انفرادی مصیبت کے لئے کوئی نہیں دوڑتا۔ دوسرے کی یزیدیت کا اعلان ہر ایک کر رہا ہے مگر اپنی یزیدیت کی خبر کسی کو نہیں —— آدمی کے الفاظ کو سننے والا سب سے پہلے خدا ہوتا ہے، پھر یہ لوگ اپنے جھوٹے الفاظ آخر کس کو سنا رہے ہیں۔

جوابی مذہبیت

مئی ۱۹۲۲ کا واقعہ ہے۔ لاہور کے شاہ عالمی دروازہ کے باہر ہندوؤں نے ایک مندر تعمیر کیا۔ یہ دیکھ کر مسلمانوں کے اندر یہ جذبہ جاگ اٹھا کہ مندر کے ساتھ مسجد بھی ہونا چاہئے۔ جس فضا میں مندر کے کلس چمک رہے ہیں وہاں مسجد کے مینار کی عظمت بھی دکھائی دینا ضروری ہے۔ چنانچہ فوراً چندہ ہوا اور مندر کے پاس ایک زمین مسجد کے لئے حاصل کی گئی۔ نماز عشاء کے بعد اس مسجد کی تعمیر شروع ہوئی۔ ساری رات کام ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ جب صبح ہوئی تو لوگوں نے دیکھا کہ مندر کے مقابلہ میں ایک مسجد بنی ہوئی کھڑی ہے۔ یہی وہ واقعہ ہے جس سے متاثر ہو کر ڈاکٹر محمد اقبال نے اپنا یہ مشہور شعر کہا تھا:

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا

یہ ایک علامتی واقعہ ہے جو موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی بیشتر سرگرمیوں پر چسپاں ہوتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں ہماری اکثر دینی سرگرمیاں حقیقۃً جوابی سرگرمیاں ہیں۔ ان کا اصل محرک کسی غیر قوم کا کوئی عمل ہے نہ کہ حقیقۃً خدا اور رسول کا حکم۔

اس قسم کی مذہبیت جوابی مذہبیت ہے۔ وہ قومی محرک کے تحت پیدا ہوتی ہے نہ کہ خدائی محرک کے تحت۔ چنانچہ مسلمانوں نے مادی اور جغرافی اور سیاسی اسباب کے تحت دیگر اقوام کو اپنا حریف سمجھ لیا ہے۔ وہ ان کو نیچا دکھا کر اپنے لئے قومی تسکین حاصل کرتے ہیں —— ایسی تمام کارروائیاں بلاشبہ قومی کارروائیاں ہیں، خواہ بظاہر ان کو مذہب کے لباس میں کیوں نہ پیش کیا گیا ہو۔

مومن وہ ہے جو خدا سے ڈرے۔ جس کی تمام سرگرمیاں خدا کے زیر اثر انجام پاتی ہوں۔ اس کا رکنا خدا کے لئے ہوتا ہو اور ٹھہرنا خدا کے لئے۔ جو کام اس طرح کے جذبات کے ساتھ کیا جائے اس کے ساتھ خدا کی مدد شامل رہتی ہے۔ وہ مفید نتائج پیدا کرتا ہے۔ مگر جو کام دوسری قوموں کی ضد میں کیا جائے اس سے صرف نفرت اور کش مکش بڑھے گی۔ اس کا نتیجہ صرف یہ ہوگا کہ صورت حال مزید پیچیدہ ہوتی چلی جائے اور کبھی وہ حسن خاتمہ تک نہ پہنچے۔

ڈر کی طاقت

حضرت عمر فاروق کی خلافت کے زمانہ میں ایک شخص تھا جس کا نام صُبیغ تھا۔ وہ عراق میں گھوم گھوم کر سورہ ذاریات کے بارے میں تقریریں کرتا اور اس سورہ کے مضامین میں عجیب عجیب قسم کے سوالات پیدا کر کے مسلمانوں کو شکوک وشبہات میں مبتلا کرتا۔

اس آدمی کو لوگوں نے سمجھایا، مگر وہ نہ مانا اس نے اپنی تقریریں جاری رکھیں۔ آخر کار عراق کے حاکم نے اس کو گرفتار کیا اور اپنے ایک قاصد کے ذریعہ اس کو خلیفہ ثانی کی خدمت میں مدینہ بھیج دیا اور لکھا کہ یہ شخص قرآن کی سورہ ذاریات کے بارے میں عجیب وغریب باتیں نکال کر مسلمانوں کو شک وشبہ میں مبتلا کرتا ہے اور ان کے عقائد کو بگاڑ رہا ہے۔

حضرت عمر نے خط کو پڑھا۔ اس کے بعد مجرم سے باتیں کیں۔ اس کو سمجھایا۔ مگر وہ شخص نہ مانا اور اپنی باتوں کو دہراتا رہا۔ اس کے بعد حضرت عمر نے درہ منگوایا اور اس کو مارنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ یہ نوبت آئی کہ وہ شخص خون میں نہا اٹھا اور مار اس کے لئے ناقابل برداشت ہوگئی۔ اب اس نے سپر ڈال دی۔ اور چلا کر کہا:

قد ذهب الذی کنت اجد ه فی رأسی — وہ چیز چلی گئی جس کو میں اپنے سر میں پا رہا تھا

(الاصابہ لابن حجر)

اس کے بعد حضرت عمر نے اس کو چھوڑ دیا۔ اپنی بقیہ عمر اس نے اس طرح گزاری کہ مذکورہ قسم کی باتیں دوبارہ اس سے نہیں سنی گئیں۔ دلیل کی زبان اس کے لئے بے اثر ثابت ہوئی تھی، مگر کوڑے کی زبان اس کے لئے اتنی مؤثر ثابت ہوئی کہ وہ ہمیشہ کے لئے اصلاح یافتہ ہوگیا۔

حقیقت یہ ہے کہ بہت سی خرابیاں صرف بے خوفی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ اگر آدمی کو سزا کا ڈر ہو تو وہ خود بخود درست ہو جائے۔ ڈر آدمی کو سنجیدہ بنا دیتا ہے۔ اور جو شخص کسی معاملہ میں سنجیدہ ہو وہ کبھی بے معنی کلام اپنی زبان سے نہیں نکالے گا، وہ الٹی حرکتیں نہیں کرے گا۔ ڈر بظاہر ایک چیز ہے۔ مگر وہ آدمی کی تمام خرابیوں کی اصلاح کر دیتا ہے۔

بے معنی مسائل

حدیث میں آیا ہے: ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم نہی عن الاغلوطات۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اغلوطات سے منع کیا ہے۔ اغلوطات سے مراد وہ مسائل ہیں جو واقع ہونے سے پہلے فرضی طور پر قائم کئے جاتے ہیں (ھی المسائل التی لم تقع)

دوسری حدیث میں ارشاد ہوا ہے:

ان اللہ کرہ لکم قیل وقال وکثرۃ السوال واضاعۃ المال — اللہ نے تمہارے لئے قیل وقال کو اور کثرت سوال کو اور مال ضائع کرنے کو ناپسند کیا ہے۔

یہ تعلیم بے حد حکمت پر مبنی ہے۔ اگر لوگوں کے اندر یہ مزاج باقی نہ رہے تو وہ ہر بات کو بحث کا موضوع بنائیں گے، ہر چیز کو منطق کے پیمانہ سے ناپیں گے۔ اس کے نتیجہ میں یہ ہوگا کہ دین کا اصل سرا چھوٹ جائے گا اور بے معنی مسائل پر لفظی بحث کے سوا ان کے پاس اور کچھ باقی نہ رہے گا۔ خدا کا سادہ دین انسانی اضافوں کے بعد مشکل اور پیچیدہ دین ہو کر رہ جائے گا۔

ایک مثال لیجئے۔

ایک مرتبہ کسی نے ایک آدمی سے پوچھا کیا تم مسلمان ہو۔ اس کی زبان سے نکلا: انا مومن انشاء اللہ (خدا نے چاہا تو میں مومن ہوں) یہ بات بحث کی نہ تھی۔ مگر ماہرین فقہ نے غیر ضروری طور پر اس کو بحث کا موضوع بنایا۔ اب ان کے درمیان یہ بحث چل پڑی کہ اس قسم کا جواب دینا جائز ہے یا ناجائز۔ ایک گروہ نے کہا کہ جائز ہے۔ کیونکہ کسی کا مومن ہونا یا نہ ہونا خدا کی مشیت ہی پر ہے۔ دوسرے گروہ نے کہا کہ ناجائز ہے۔ کیونکہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آدمی کو اپنے ایمان میں شک ہے۔

شافعی مسلک کے لوگ اس کے قائل تھے کہ انا مومن انشاء اللہ کہنا جائز ہے۔ اس کے برعکس حنفی مسلک کے لوگوں کا کہنا تھا کہ ایسا کہنا جائز نہیں۔ جب یہ بحث بڑھی تو یہ سوال پیدا ہو گیا کہ ایسے لوگوں کے درمیان نکاح درست ہوگا یا نہیں۔ ایک گروہ نے کہا کہ حنفی عورت کا نکاح شافعی مرد کے ساتھ جائز نہیں۔ کیونکہ اس کو اس کے ایمان پر شک ہے (لا یصح لانہا تشک فی ایمانہا) دوسروں کا فتویٰ یہ تھا ذمی عورت پر قیاس کرتے ہوئے نکاح درست ہوگا (یصح قیاسا علی الذمیۃ)

اس سے اندازہ کیجئے کہ غیر ضروری بحثوں میں پڑنے کے بعد صراط مستقیم کا سرا کس طرح چھوٹ جاتا ہے۔

آزمائش

قرآن میں ارشاد ہوا ہے : کیا لوگوں نے سمجھ رکھا ہے کہ وہ اتنا کہنے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور ان کو آزمایا نہ جائے گا۔ حالاں کہ ہم ان سب لوگوں کی آزمائش کر چکے ہیں جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں۔ پس ضرور ہے کہ اللہ یہ جان لے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون (عنکبوت ۳) دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے : کیا تم لوگوں نے یہ سمجھا ہے کہ تم کو جنت کا داخلہ مل جائے گا۔ حالاں کہ ابھی تم پر وہ حالات گزرے ہی نہیں جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکے ہیں۔ ان پر سختیاں گزریں اور مصیبتیں آئیں اور وہ ہلا مارے گئے۔ یہاں تک کہ رسول اور اس کے ساتھی اہل ایمان پکار اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی۔ سن لو کہ اللہ کی مدد قریب ہے (بقرہ ۲۱۴)

اسی طرح ارشاد ہوا ہے کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم چھوڑ دیے جاؤ گے۔ حالانکہ ابھی اللہ نے جانا ہی نہیں کہ تم میں کون لوگ ہیں جنھوں نے جہاد کیا اور اللہ اور رسول اور مومنین کے سوا کسی کو دوست نہیں بنایا۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے (توبہ ۱۶) اسی طرح ارشاد ہوا ہے : کیا تم نے سمجھا ہے کہ تم جنت میں چلے جاؤ گے۔ حالانکہ ابھی اللہ نے یہ جانا ہی نہیں کہ تم میں سے کون ہیں جنھوں نے جہاد کیا اور کون ہیں جو صبر کرنے والے ہیں (آل عمران ۱۴۲)

یہی بات حدیث میں ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے :

اشد الناس بلاء الانبیاء ثم الصالحون ثم الامثل فالامثل۔ یبتلی الرجل علی حسب دینہ فان کان فی دینہ صلابۃ زید لہ فی البلاء (تفسیر ابن کثیر)

سب سے زیادہ سخت آزمائش پیغمبروں کی ہے۔ ان کے بعد صالحین کی، پھر درجہ بدرجہ ان سے مشابہت رکھنے والوں کی۔ آدمی کا امتحان اس کے دین کے مطابق ہوتا ہے۔ پس اگر اس کے دین میں مضبوطی ہو تو اس کی آزمائش میں اضافہ کر دیا جاتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ آدمی کی جنت یا اس کی ترقی درجات کا فیصلہ معمول کی دین داری پر نہیں ہوتا۔ بلکہ ان خاص لمحات میں ہوتا ہے جب کہ اس کا رب اس کے دین کا امتحان لے رہا ہو۔ مگر عجیب بات ہے کہ آدمی ٹھیک اسی مقام پر ناکام ہو جاتا ہے جہاں اس کو کامیابی کا ثبوت دینا چاہیے۔

بے کاری

كان عمر بن الخطاب رضى الله عنه يقول: ارى الرجل يعجبنى فاذا قيل لا صناعة له سقط من عينى (التراتيب الادارية للكتانى، جزء ۲ صفحه ۲۳)

حضرت عمر فرماتے تھے کہ میں کسی آدمی کو دیکھتا ہوں اور وہ مجھے پسند آتا ہے۔ مگر جب معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی کام نہیں کرتا تو وہ میری نگاہوں سے گر جاتا ہے۔

یہی روایت ابن الجوزی نے تلبیس ابلیس میں ان الفاظ میں نقل کی ہے:

عن محمد بن عاصم قال: بلغنى ان عمر بن الخطاب كان اذا رأى غلاما فاعجبه سأل هل له حرفة۔ فان قيل لا، سقط من عينه

محمد بن عاصم کہتے ہیں کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ حضرت عمر جب کسی نوجوان کو دیکھتے اور وہ انھیں اچھا معلوم ہوتا تو پوچھتے کیا اس کا کوئی کام ہے۔ اگر کہا جاتا کہ نہیں تو وہ ان کی نگاہ سے گر جاتا۔

حقیقت یہ ہے کہ بے کاری نہایت بری چیز ہے۔ وہ آدمی کی تمام بہترین صلاحیتوں کو کھا جاتی ہے۔ بے کار آدمی بظاہر دیکھنے میں زندہ معلوم ہوتا ہے مگر حقیقۃً وہ ایک مرا ہوا انسان ہوتا ہے۔ اس کے اندر سے وہ تمام لطیف احساسات ختم ہو جاتے ہیں جو کسی انسان کو حقیقی معنوں میں انسان بناتے ہیں۔

بے کاری کی ایک صورت وہ ہے جب کہ آدمی محنت اور مشقت کی چیزوں سے گھبراتا ہے اور اس کے اندر یہ صلاحیت موجود نہیں ہوتی کہ کوئی بے مشقت کا کام اسے مل جائے۔ چنانچہ وہ اپنے پسندیدہ کام کے انتظار میں بے کار پڑا رہتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی کو وراثت میں یا اور کسی اتفاقی سبب سے ایسے ذرائع معاش حاصل ہو جائیں جن کے لئے اس نے کوئی ذاتی کسب نہیں کیا تھا۔ مثلاً بینک میں جمع شدہ رقم۔ یا جائداد جس کی آمدنی یا کرایہ اس کو اپنے آپ ہر ماہ ملتا رہے۔ اس قسم کی ہر صورت بے کاری کی صورت ہے اور وہ آدمی کے لئے قاتل ہے، خواہ بظاہر وہ خوش پوش ہو اور چلتا پھرتا نظر آتا ہو۔

ہر آدمی کو چاہئے کہ وہ اپنے لئے کوئی جائز کام اختیار کرے اور صبح شام اپنے آپ کو اس میں مشغول رکھے۔ جس کے پاس کام کی مشغولیت نہیں اس کے پاس زندگی بھی نہیں۔ بے کار آدمی کو کبھی بھی آپ اعلیٰ انسان نہیں پائیں گے۔

جرم کی نفسیات

لینن (Lennon) اور چیپ مین Chapman امریکہ کے دو بیٹل سنگر (Beatle Singer) تھے۔ لینن کو نسبتاً زیادہ کامیابی ہوئی۔ وہ کافی مشہور ہوگیا۔ یہ بات چیپ مین کو برداشت نہ ہوسکی۔ اس کے دل میں لینن کے خلاف حسد کا جذبہ جاگ اٹھا۔ یہ جذبہ بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ اس نے ایک روز موقع پاکر لینن کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔

اخباری رپورٹ کے مطابق اس قتل کا سبب پیشہ ورانہ رقابت (Professional Rivalry) تھی۔ اس کے بعد چیپ مین کے خلاف مقدمہ چلا۔ قاتل نے اس سلسلے میں عدالت میں اپنا جو بیان دیا، اس میں اپنی برات ظاہر کرتے ہوئے اس نے کہا تھا:

> There is something bad within me, and there is something good within me too. When this little bad within me overpowers my goodness, I do bad deeds.

میرے اندر کچھ برائی ہے۔ اسی کے ساتھ میرے اندر کچھ بھلائی بھی ہے، جب میری برائی میری بھلائی پر غالب آجاتی ہے تو اس وقت میں برا کام کر بیٹھتا ہوں۔

قاتل کا یہ جملہ اگر سنجیدہ ذہن کے تحت نکلا ہے تو یقیناً وہ فطرت کی ترجمانی ہے۔ بلاشبہ کچھ مجرم عادی مجرم ہوتے ہیں، ان کو معاف کرنا انسانیت کے اوپر ظلم کرنا ہے۔ مگر بہت سے جرم کرنے والے محض وقتی جذبہ کے تحت جرم کرتے ہیں۔ اس کے بعد ان کی فطرت زور کرتی ہے۔ اپنے جرم پر انھیں اس قدر افسوس لاحق ہوتا ہے کہ ان کا افسوس خود ان کے لئے ایک داخلی سزا بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں اس بات کی بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے کہ غلطیوں کو معاف کرو۔ وقتی جذبہ کے تحت جب ایک آدمی کوئی برائی کر بیٹھتا ہے تو اس کے بعد اس کے دل میں خود ہی اس کے خلاف شرمندگی اور افسوس کے جذبات ابھر آتے ہیں۔ اس وقت اگر ہم اس کو معاف کر دیں تو گویا ہم نے اس کے احساس ندامت کو سہارا دیا اور اس کو اس قابل بنایا کہ وہ اپنی غلطی کی تلافی کرے اور دوبارہ ایسی غلطی کرنے سے بچے۔

اسلام میں اگرچہ قتل کی سزا قتل ہے تاہم ایک خاص صورت کے ساتھ اس کو قابل معافی بھی رکھا گیا ہے۔ وہ یہ کہ مقتول کے ورثاء اگر قاتل سے دیت لینے پر راضی ہوجائیں تو اس کو دیت لے کر چھوڑ دیا جائے اور اس کو قتل نہ کیا جائے۔

داعی بننے کے لئے

مائیکل فیراڈے (Michael Faraday) اور لارنس براگ (Lawrence Bragg) عہد جدید کے بہت کامیاب معلم سمجھے جاتے ہیں۔ یہ دونوں لندن کے رائل انسٹی ٹیوٹ میں لکچر دیا کرتے تھے۔

کامیاب لکچر کا راز کیا ہے، اس کے بارے میں دونوں کی یادداشتیں شائع ہوئی ہیں۔ ہم بالترتیب دونوں کا ایک ایک فقرہ یہاں نقل کرتے ہیں جو گویا ان کے تجربات کا خلاصہ ہے۔

I am sorry to say that the generality of mankind cannot accompany us one short hour unless the path is strewn with flowers

میں افسوس کے ساتھ یہ کہوں گا کہ بیشتر انسان ایک گھنٹہ کے مختصر وقت میں بھی ہمارے ہم سفر نہیں بن سکتے الّا یہ کہ راستہ پھولوں سے سجا دیا گیا ہو۔

The essential feature for success of the lecture is the emotional contact between the lecturer and the students

لکچر کی کامیابی کے لئے ضروری بات یہ ہے کہ استاد اور طالب علم کے درمیان جذباتی ربط قائم ہو جائے۔

فیراڈے اور براگ نے جو بات کامیاب معلم بننے کے لئے لکھی ہے، وہی زیادہ شدت کے ساتھ کامیاب داعی بننے کے لئے ضروری ہے۔

داعی اور مدعو کا تعلق بے حد نازک تعلق ہے۔ وہ اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتا جب تک اس کی نزاکتوں کی پوری رعایت نہ کی جائے۔ اپنے مدعو کو اپنا ہم سفر بنانے کے لئے آپ کو اس کے راستہ میں پھول بکھیرنا ہوگا۔ راستہ میں کانٹے اور پتھر بچھا کر آپ مدعو کو اپنا ہم سفر نہیں بنا سکتے۔

اسی طرح اپنی بات کو اس کے لئے قابل سماعت بنانے کی خاطر آپ کو یہ کرنا ہوگا کہ اس کو اتنے موثر انداز میں کہیں کہ آپ کی بات محض ایک خشک تلقین نہ معلوم ہو بلکہ وہ سننے والے کے لئے ایک ایسا تجربہ بن جائے جس میں وہ اپنے لئے ایک کیفیاتی کشش پاتا ہو۔

یہ بھی ممکن ہے

برطانی فلسفی راشڈل ہیسٹنگز (۱۹۲۴ – ۱۸۵۸) نے لکھا ہے کہ بارھویں صدی عیسوی میں جب ابن رشد کی کتابیں یورپ میں پھیلیں تو اس کا فلسفہ عیسائیوں کو اپنے حق میں شدید خطرہ محسوس ہونے لگا۔ چنانچہ ۱۲۱۰ء میں پیرس یونیورسٹی کونسل نے ایک متفقہ فیصلہ کیا اور اس کے مطابق ارسطو کی طبیعی تاریخ اور اس پر لکھی ہوئی ابن رشد کی شرحوں کو تعلیم و تدریس کے لئے ممنوع قرار دے دیا گیا۔

مگر یہ فیصلہ بہت دیر تک باقی نہ رہ سکا۔ کچھ عرصہ بعد یونیورسٹی کے ذمہ داروں کو احساس ہوا کہ انھوں نے ایسا کرکے اپنے طلبہ کو علم کے خزانہ سے محروم کر دیا ہے۔ چنانچہ نہ صرف ممنوعہ کتابیں دوبارہ داخل نصاب کی گئیں بلکہ نئے قاعدہ کے مطابق یونیورسٹی کے فارغ طلبہ سے یہ حلف لیا جانے لگا کہ وہ صرف ان چیزوں کو اپنی تعلیم و تدریس میں استعمال کریں گے جو ابن رشد کی شرح کے مطابق ارسطو کے خیالات سے ہم آہنگ ہو:

Rashdall Hastings, Universities, p. 368

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر آدمی کے اندر کوئی خوبی ہو تو مخالف بھی کس طرح اس کو ماننے پر مجبور ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ اگر کچھ لوگ تعصب یا ضد میں ابتداءً آپ کو نہ مانیں تو اس نہ ماننے کو بھی مستقل نہ سمجھئے۔ اگر فی الواقع آپ کے اندر کوئی قابل قدر چیز ہے تو جلد وہ دن آئے گا جب کہ نہ ماننے والے کو اپنے نہ ماننے پر پچھتاوا ہو اور وہ دوبارہ آپ کے اعتراف پر مجبور ہو جائے۔

ابن رشد دنیا میں موجود نہ تھا کہ وہ اپنا دفاع کرے یا اپنے حق کے حصول کے لئے احتجاج و مطالبہ کی مہم چلائے۔ تاہم اس کا عمل لوگوں کے سامنے موجود تھا۔ پیرس یونیورسٹی کے ذمہ داروں نے ابن رشد کی تعلیم تو بند کر دی۔ مگر بہت جلد ان کو احساس ہوا کہ ابن رشد کی کتابوں کا بدل ان کے پاس موجود نہیں ہے۔ ابن رشد خواہ ان کے لئے ایک غیر مطلوب انسان ہو مگر اپنی نسلوں کی تعلیم تو بہر حال ان کے لئے ایک مطلوب چیز تھی۔ بالآخر انھیں محسوس ہوا کہ ابن رشد کو چھوڑنا صرف اس قیمت پر ممکن ہے کہ خود اپنی نسلوں کی تعلیم ناقص رہ جائے۔ وہ ابن رشد کو نظر انداز کر سکتے تھے مگر اپنے آپ کو نظر انداز کرنا ان کے لئے ممکن نہ تھا۔ چنانچہ انھوں نے ابن رشد کی کتابوں کو دوبارہ اختیار کر لیا —— کوئی شخص اگر یہ حیثیت حاصل کر لے کہ وہ دوسروں کی ضرورت بن جائے تو دوسرے اس کو نظر انداز نہیں کر سکتے، خواہ یہ دوسرے اس کے حریف کیوں نہ ہوں۔

غلط استدلال

وکیع بن الجراح (۱۹۷-۱۲۹ھ) اپنے زمانہ کے ایک بڑے محدث تھے۔ وہ نہایت متقی انسان تھے چنانچہ خلیفہ ہارون الرشید نے ان کو قاضی کا عہدہ پیش کیا تو انھوں نے انکار کر دیا اور اپنی تمام عمر حدیث کی جمع و تدوین میں گزار دی۔ وہ اپنے وطن کوفہ سے حج کے ارادہ سے مکہ روانہ ہوئے تھے کہ راستہ میں ان کا انتقال ہوگیا۔

وکیع بن الجراح کے ایک معاصر نے (تعریفی طور پر) ان کے بارے میں کہا کہ میں نے وکیع کو دیکھا۔ میں نے ان کے ہاتھ میں کوئی کتاب نہیں دیکھی۔ وہ حدیثوں کے حافظ تھے (رأیت وکیعا وما رأیت بیدہ کتابا قط، انما ھو یحفظ، التہذیب لابن حجر، جلد ۱۱ صفحہ ۱۱۹)

گولڈ زیہر نے اس قول کو لے کر لکھا ہے کہ وکیع نے کتاب اور کاغذ چھوڑ رکھا تھا، وہ صرف زبانی طور پر حدیث سنتے اور سناتے تھے۔ گولڈ زیہر کا مقصد اس سے حدیث کی صحت کو مشکوک ثابت کرنا ہے۔ کیونکہ تحریر کے مقابلہ میں یادداشت بہرحال ایک غیر معتبر ذریعہ ہے۔

مگر گولڈ زیہر کا یہ استدلال اس وقت غلط معلوم ہوتا ہے جب کہ ہم اسی کتاب میں یہ دیکھتے ہیں کہ امام احمد بن حنبل نے اپنے شاگردوں کو وصیت کرتے ہوئے کہا: تمھارے لئے لازم ہے کہ تم وکیع کی کتابوں کو پڑھو (علیکم بمصنفات وکیع، التہذیب لابن حجر جلد ۱۱ صفحہ ۱۲۶) اگر ان کی کتابیں نہ ہوتیں تو احمد بن حنبل اس طرح کا مشورہ کیوں دیتے۔ امام وکیع کی کتابوں میں سے چند کتابیں یہ ہیں:

کتاب الزہد

المصنف

التفسیر (الکشف والبیان للثعلبی)

وکیع بن الجراح کے واقعات بتاتے ہیں کہ ان کا حافظہ غیر معمولی طور پر اچھا تھا۔ وہ اگرچہ احادیث کو باقاعدہ لکھتے تھے۔ مگر مجالس میں اکثر حافظہ کی مدد سے احادیث کو بیان کرتے تھے۔ امام وکیع سے متعلق تمام واقعات کو دیکھئے تو مذکورہ قول میں کوئی ہرج نظر نہیں آتا۔ مگر گولڈ زیہر نے بقیہ چیزوں کو چھوڑ کر صرف ایک جزء کو لے لیا تو وہ اس کے لئے اس بات کی دلیل بن گیا کہ حدیث کا موجودہ ذخیرہ مشتبہ ذخیرہ ہے، اس کی صحت پر مکمل اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

تاریخ کا فتنہ

سأل ابو زرعة شيخه البلقيني قائلا : ما تقصير الشيخ تقي الدين السبكي عن الاجتهاد وقد استكمل آلته۔ فسكت البلقيني۔ فقال ابو زرعة : فما عندي ان الامتناع عن ذلك الا للوظائف التي قدرت للفقهاء على المذاهب الاربعة وان من خرج عن ذلك لم ينله شئ من ذلك وحرم ولاية القضاء وامتنع الناس عن افتائه ونسبت اليه البدعة فابتسم البلقيني ووافقه على ذلك (السيد سابق، فقہ السنۃ، المجلد الاول، صفحہ ۱۴-۱۳)

ابو زرعہ نے اپنے استاد بلقینی سے پوچھا کہ شیخ تقی الدین سبکی اجتہاد کیوں نہیں کرتے جب کہ ان کے اندر اس کی شرائط موجود ہیں۔ بلقینی چپ رہے۔ ابو زرعہ نے کہا کہ ان کے اجتہاد سے رکنے کی وجہ میرے نزدیک تو صرف وہ وظائف ہیں جو مذاہب اربعہ کے فقہاء کے لئے مقرر کئے گئے ہیں۔ جو ان مذاہب سے نکلے گا وہ ان وظائف میں سے کچھ نہیں پا سکتا، وہ قاضی کے عہدہ پر باقی نہ رہے گا، لوگ اس کے فتوے کو قبول نہیں کریں گے۔ اور اس کو بدعتی کہنے لگیں گے۔ یہ سن کر بلقینی ہنسے اور ان کی رائے سے اتفاق کیا۔

دین کے نام پر جو چیز شروع کی جائے، اگر وہ ایک مدت تک باقی رہے تو بالآخر وہ مقدس سمجھی جانے لگتی ہے، یہاں تک کہ وہ نوبت آتی ہے کہ اس کے ساتھ دنیوی قدر پیدا ہو جاتی ہے۔ اس سے منسوب ہو کر آدمی کو ماحول میں عزت ملتی ہے، اس سے وابستگی سے آدمی کے لئے عہدوں اور مفادات کے دروازے کھلتے ہیں۔ اس کے نام پر "آج" کے ایک آدمی کو وہ حیثیت حاصل ہو جاتی ہے جو "کل" کے ایک آدمی کو تاریخی روایات کے نتیجہ میں حاصل ہو چکی ہے۔

ایسے ماحول میں لوگ اس حق کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے جس کے ساتھ تاریخی شخصیت کا نام شامل نہ ہو۔ وہ "تاریخ" کے پرستار بن کر رہ جاتے ہیں، حق کے پرستار کی حیثیت سے ان کا وجود ختم ہو جاتا ہے۔

لوگ ہمیشہ زندہ شخصیت کو نظر انداز کرتے ہیں اور تاریخی طور پر مسلمہ شخصیت کے ساتھ خوب تعلق ظاہر کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ مسلمہ شخصیتوں کے ساتھ مادی مفادات وابستہ ہو جاتے ہیں، جب کہ زندہ شخصیت کے ساتھ اس قسم کا کوئی پہلو وابستہ نہیں ہوتا۔

جب جھٹکا لگتا ہے

ابتدائی زمانہ کے ترک سلطان بہت سادہ زندگی گزارتے تھے۔ وہ لوگوں کے درمیان ایک عام انسان کی طرح رہتے تھے۔ حتّٰی کہ وہ دربار میں بھی کسی غیر معمولی اہتمام کے بغیر بیٹھتے تھے۔ اس کے بعد ایک چھوٹا سا واقعہ ہوا اور اس نے ترک سلاطین کے انداز کو بالکل بدل دیا۔

سلطان محمد ثانی (۱۴۸۱ – ۱۴۵۱) وہ ترک حکمراں ہے جس نے قسطنطنیہ کو فتح کیا اور اس کے بعد سلطان محمد فاتح کے عظیم نام سے مشہور ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بار وہ اپنے وزیروں کے ساتھ مجلس میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس اثنا میں ایک کسان کوئی فریاد لے کر حاضر ہوا۔ یکساں قسم کے لوگوں کے درمیان وہ سمجھ نہ سکا کہ وہ کس سے مخاطب ہو۔ اس نے کہا:

تم میں سے سلطان کون ہے

سلطان محمد فاتح نے ایک دیہاتی کی زبان سے یہ الفاظ سنے تو وہ اس کو بہت ناگوار گزرے۔ اس نے محسوس کیا کہ دیہاتی نے بھرے مجمع میں اس کی توہین کر دی۔ وہ اٹھ کر خاموشی سے اپنے محل کے اندر چلا گیا۔ اس کی سادہ مزاجی پر اس کا احساس سلطانی غالب آگیا اور اس کے بعد سے اس نے وزیروں اور درباریوں کی مجلس میں بیٹھنا بند کر دیا۔

سلطان نے اب یہ طریقہ اختیار کیا کہ وہ لوگوں سے الگ ایک دریچہ کے پیچھے بیٹھتا اور وہاں بیٹھ کر اپنے وزیروں کی باتیں یا لوگوں کی درخواستیں سنتا۔ دھیرے دھیرے مزید تبدیلی آئی اور بعد کو یہ اصول بھی باقی نہ رہ سکا۔

سلطان سلیمان اعظم (۱۵۶۶ – ۱۵۲۰) کے دور سے ایسا ہوا کہ سلاطین ترکی نے وزیروں کی مجلس میں شرکت بالکل بند کر دی۔ اس کے بعد یہ ہونے لگا کہ وزراء کی مجلس صدر اعظم کے ساتھ بیٹھ کر بحث و مشورہ کرتی اور اس کے بعد وہ جس فیصلہ تک پہنچتی اس کو صدر اعظم سلطان تک پہنچا دیتا۔ سلطان اس کو سن کر اپنا حکم سنا دیتا جو اس باب میں آخری ہوتا۔

آدمی بظاہر اچھا ہوتا ہے۔ وہ دیکھنے والوں کو ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔ مگر یہ صورت حال اسی وقت تک باقی رہتی ہے جب تک کوئی جھٹکا نہ پڑے۔ جب اس کے نفس کو کوئی جھٹکا لگتا ہے تو اس کے بعد وہ بدل کر دوسرا انسان بن جاتا ہے۔

حالات کے نتیجہ میں

امام مالک سے پوچھا گیا کہ جبری طور پر کسی سے طلاق لی جائے تو طلاق واقع ہوگی یا نہیں۔ انھوں نے کہا کہ جبری طلاق طلاق نہیں ہے۔ یہ خلیفہ منصور کا زمانہ تھا۔ مدینہ میں اس کا جو گورنر تھا اس نے امام مالک کو ایسا فتویٰ دینے سے روکا۔ مگر امام مالک نہ مانے۔ اس کے بعد گورنر نے حکم دیا کہ امام مالک کو نوے کوڑے مارے جائیں۔ چنانچہ حکم کی تعمیل ہوئی۔ اور ان کی پیٹھ ننگی کر کے اس پر ۹۰ کوڑے مارے گئے (مرآۃ الجنان)

کوڑے کی مار سے اگرچہ امام مالک کی پیٹھ خون آلودہ ہوگئی تھی۔ لیکن گورنر نے دیکھا کہ اب بھی امام مالک کے اندر کوئی نرمی پیدا نہیں ہوئی ہے۔ اس نے حکم دیا کہ ان کے پاؤں میں زنجیر ڈالی جائے اور چہرہ پر سیاہی لگا کر مدینہ کے راستوں میں گھمایا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور اونٹ پر بٹھا کر ان کو مدینہ کے راستوں میں گھمایا گیا۔ امام مالک کا حال یہ تھا کہ اس وقت بھی وہ کہتے جاتے تھے: جو مجھ کو جانتا ہے وہ جانتا ہے اور جو نہیں جانتا تو میں مالک بن انس ہوں اور یہ کہتا ہوں کہ زبردستی کی طلاق کچھ نہیں ہے (من عرفنی فقد عرفنی ومن لم یعرفنی فانا مالک بن انس، اقول ان طلاق المکرہ لیس بشیئ)

ایک خالص غیر سیاسی فتوے پر وقت کے سیاسی حاکم نے اتنا شدید ردعمل کیوں ظاہر کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ فتویٰ اگرچہ بذات خود غیر سیاسی تھا۔ مگر وقت کے مخصوص حالات کی وجہ سے اس کے اندر سیاسی اہمیت پیدا ہوگئی تھی۔

اس زمانہ میں عملاً نسلی بادشاہت چل پڑی تھی۔ تاہم اسلام کے اثر سے حکمراں اس کو بھی ضروری سمجھتے تھے کہ وہ لوگوں سے بیعت لیں اور عوام کو یہ تاثر دیں کہ وہ عوامی رائے سے خلیفہ بنے ہیں نہ کہ محض شاہی خاندان سے تعلق کی وجہ سے۔ مگر عوام ان حکمرانوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ خلفاء جبری طور پر لوگوں سے بیعت لیتے تھے۔ اس پس منظر میں امام مالک کا فتویٰ بہت معنی خیز تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جبری طلاق جس طرح بے اعتبار ہے اسی طرح جبری بیعت بھی بے اعتبار ہے۔ گورنر کو اندیشہ ہوا کہ امام مالک کے فتوے کی وجہ سے خلیفہ کی بیعت لوگوں کی نگاہ میں غیر معتبر نہ ہو جائے۔ اسی لئے اس نے اس کا اتنا سخت نوٹس لیا۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح ایک خالص غیر سیاسی مسئلہ بھی مخصوص حالات کے نتیجہ میں سیاسی مسئلہ بن جاتا ہے۔ قدیم زمانہ میں مشرک بادشاہوں کا دعوت توحید کے خلاف شدید ردعمل بھی اسی قسم کے حالات کا نتیجہ تھا۔

قومی کردار

۱۹۶۵ کا واقعہ ہے۔ ہندستان کے ایک صنعت کار مغربی جرمنی گئے۔ وہاں ان کو ایک کارخانہ میں جانے کا موقع ملا۔ وہ اِدھر اُدھر گھوم کر کارخانہ کی کارکردگی دیکھتے رہے۔ اس درمیان میں وہ ایک کاریگر کے پاس کھڑے ہو گئے اور اس سے کچھ سوالات کرنے لگے۔ باربار خطاب کرنے کے باوجود کاریگر نے کوئی توجہ نہیں دی۔ وہ بدستور اپنے کام میں لگا رہا۔

کچھ دیر کے بعد کھانے کے وقفہ کی گھنٹی بجی۔ اب کاریگر اپنی مشینوں سے اٹھ کر کھانے کے ہال کی طرف جانے لگے۔ اس وقت مذکورہ کاریگر ہندستانی صنعت کار کے پاس آیا۔ اس نے صنعت کار سے ہاتھ ملایا اور اس کے بعد تعجب کے ساتھ کہا: کیا آپ اپنے ملک کے کاریگروں سے کام کے وقت بھی باتیں کرتے ہیں۔ اگر اس وقت میں آپ کی باتوں کا جواب دیتا تو کام کے چند منٹ ضائع ہو جاتے اور کمپنی کا نقصان ہو جاتا۔ جس کا مطلب پوری قوم کا نقصان تھا۔ ہم یہاں اپنے ملک کو فائدہ پہنچانے آتے ہیں، ملک کو نقصان پہنچانے کے لئے نہیں آتے۔

یہی وہ کردار ہے جو مغربی قوموں کی ترقی کا راز ہے۔ ۱۹۴۵ میں اتحادی طاقتوں (الائڈ پاورس) نے جرمنی کو بالکل تباہ کر دیا تھا، مگر صرف ۲۵ سال بعد جرمنی دوبارہ پہلے سے زیادہ طاقت ور بن چکا ہے اور اس ترقی کا راز یہی ہے کہ وہاں کا ہر فرد اپنی یہ ذمہ داری سمجھتا ہے کہ وہ اپنی ڈیوٹی کو بخوبی طور پر انجام دے۔ وہ اپنی ذات کو اپنی قوم کے تابع سمجھتا ہے۔ ہر آدمی اپنی ذات کی تکمیل میں لگا ہوا ہے۔ مگر قومی مفاد کی قیمت پر نہیں بلکہ ذاتی جدوجہد کی قیمت پر۔ جہاں ذات اور قوم کے مفاد میں ٹکراؤ ہو، وہاں وہ قوم کے مفاد کو ترجیح دیتا ہے، اور اپنی ذاتی خواہش کو دبا لیتا ہے۔

قوم کی حالت کا انحصار ہمیشہ فرد کی حالت پر ہوتا ہے۔ فرد کے بننے سے قوم بنتی ہے اور فرد کے بگڑنے سے قوم بگڑ جاتی ہے۔ قوم کا معاملہ وہی ہے جو مشین کا معاملہ ہوتا ہے۔ مشین اسی وقت صحیح کام کرتی ہے جب کہ اس کے پرزے صحیح ہوں۔ اسی طرح قوم اس وقت درست رہتی ہے جب کہ اس کے افراد اپنی جگہ پر درست کام کر رہے ہوں۔ مشین بنانا یہ ہے کہ پرزے بنائے جائیں۔ اسی طرح قوم بنانا یہ ہے کہ افراد بنائے جائیں۔ فرد کی اصلاح کے بغیر قوم کی اصلاح اسی طرح ناممکن ہے جس طرح پرزے تیار کئے بغیر مشین کھڑی کرنا۔

نظام تعلیم

چارلس ایڈمس ایک امریکی عیسائی تھے۔ انھوں نے مصر میں رہ کر وہاں کی اسلامی تحریکوں کا گہرا مطالعہ کیا۔ اس کے بعد انھوں نے ایک کتاب لکھی جس کا نام ہے :

Islam and Modernism in Egypt

اس کتاب میں ایک جگہ وہ جامعہ ازہر (قاہرہ) پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں " روایت پرستی کی روح صدیوں سے جامعہ ازہر کی تعلیمی سرگرمیوں میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ تعلیم کا اصل مقصد یہ نہیں ہے کہ علمی تحقیق اور چھان بین کے ذریعہ متعلقہ علوم کو ترقی دی جائے۔ تعلیم کا مقصد صرف یہ ہے کہ اس کے ذریعہ قدماء کا ذہنی سرمایہ ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتا رہے، بعینہ اسی حالت میں جیسا کہ اسلاف نے اپنے بعد والوں کو دیا تھا۔ آزادانہ تحقیق اور آزادانہ رائے قائم کرنے کا دروازہ اسلام میں تیسری صدی ہجری سے بند ہے۔ اس لئے مذہب کے مستند شارحین صرف دور ماضی میں ملتے ہیں اور بعد والوں کے لئے صرف یہ کام رہ گیا ہے کہ وہ اپنے اسلاف کے علمی سرمایہ کی شرح کرتے رہیں"

اس کتاب کی اشاعت کے بعد مصر کی جامعہ ازہر میں کافی تبدیلیاں ہو چکی ہیں۔ مصنف کا تبصرہ اب اس پر صرف جزئی طور پر ہی صادق آتا ہے۔ تاہم ہندستان اور دوسرے بہت سے ملکوں کے اسلامی مدارس کے لئے یہ الفاظ آج بھی پوری طرح درست ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ اسلامی تعلیم کا معاملہ عام سیکولر تعلیم سے مختلف ہے۔ سیکولر تعلیم مطلق طور پر آزادانہ تحقیق کی قائل ہے۔ جب کہ اسلامی تعلیم کی بنیاد ہمیشہ قرآن وسنت پر ہوتی ہے۔ مگر ہمارے مدارس میں آج جو تعلیم دی جارہی ہے اس کے متعلق یہ بات بالکل صحیح ہے کہ اس کی بنیاد کتاب وسنت پر نہیں بلکہ ایک خاص دور میں پیدا ہونے والے کتاب وسنت کے شارحین پر ہے۔ کتابوں کی ایک خاص فہرست ہے جن کو مقدس مقام حاصل ہو گیا ہے۔ حتیٰ کہ اب قرآن وحدیث بھی انھیں کتابوں کی روشنی میں پڑھائے جاتے ہیں نہ کہ ان کتابوں کو قرآن وحدیث کی روشنی میں پڑھایا جائے۔

اس طرز تعلیم کا براہ راست نتیجہ جمود اور تنگ نظری ہے۔ یہ جمود اور تنگ نظری آج مسلم قوم کا سب سے بڑا خاصہ بن چکی ہے اور ہم اس کے وہ تمام نتائج بھگت رہے ہیں جو ایسی ذہنیت سے لازماً پیدا ہوتے ہیں۔

کامیابی کا راز

ایک جاہل شخص ہندستان سے عراق گیا۔ وہاں سے وہ دو سال کے بعد واپس آیا تو ایک آدمی نے پوچھا کہ کتنا پیسہ کما کر لائے۔ اس نے کہا کہ میں زیادہ تو نہیں کما سکا۔ پھر بھی کھا پی کر پچاس ہزار روپے لایا ہوں۔ آدمی نے دوبارہ پوچھا کہ یہ بتاؤ کہ پیسہ حاصل کرنے کا راز کیا ہے۔ اس نے جواب دیا:

بھائی صاحب، میں نے تو یہ جانا کہ من مارو گے تو منی پاؤ گے۔

منی (دولت) پانے کا راز یہ ہے کہ آدمی صبر کے ساتھ کام کرے، اپنے ذوق پر چلنے کے بجائے دوسروں کی رعایت کرتے ہوئے جدوجہد کرے۔ کیونکہ دولت حاصل کرنے کا مطلب دوسروں کی جیب سے دولت نکالنا ہے۔ پھر اگر آپ دوسروں کی رعایت نہ کریں گے تو دوسرا شخص آپ کو یہ موقع کیوں دے گا کہ آپ اس کے جیب کی دولت نکال کر اپنی جیب میں ڈالیں۔

دولت حاصل کرنے کا راز من کو مارنا ہے۔ اپنے ذوق پر چلنے کے بجائے دوسرے کے ذوق پر چلنا ہے۔ یہی بات دوسرے مقاصد کے لئے بھی صحیح ہے اور یہی بات دینی مقصد کے لئے بھی۔ اس دنیا میں آدمی کو دوسرے بہت سے لوگوں کے درمیان کام کرنا پڑتا ہے۔ اپنے سے باہر بہت سے حالات سے مقابلہ کر کے اپنا سفر جاری کرنا ہوتا ہے۔ اس لئے اس دنیا میں کوئی کامیابی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک یہ نہ ہو کہ آدمی اپنے ذاتی خول سے باہر آئے، وہ اپنی من مانی کارروائی کرنے کے بجائے دوسرے افراد اور خارجی حالات کی رعایت کرتے ہوئے اپنا راستہ نکالے۔ وہ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی شامل کرلے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اس دنیا میں آدمی اپنے آپ کو کھل کر دوسرے کو پاتا ہے۔ خارجی تقاضوں کا اعتراف کر کے وہ خارج سے اپنا اعتراف کروانے میں کامیاب ہوتا ہے۔ اپنے سے باہر کی دنیا کو کچھ دینے کے بعد ہی اس کے لئے یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ باہر کی دنیا سے اپنے آپ کے لئے کچھ پا سکے۔

یہ تضاد کیوں

آسمان کے نیچے ہونے والے تمام واقعات میں سب سے زیادہ عجیب واقعہ یہ ہے کہ یہاں داداگیری کی صلاحیت کا استعمال ہے مگر سنجیدگی کی صلاحیت کا کوئی استعمال نہیں۔ یہاں شاطر آدمی اپنی پوری قیمت پالیتا ہے مگر شریف آدمی کو یہاں کوئی قیمت نہیں ملتی۔ ہر ایک کو خوش کرنے والی زبان بولنے والے کو یہاں خوب مقبولیت حاصل ہوتی ہے۔ مگر جو شخص غیر مصلحت پرستانہ انداز میں بولے اور حق کو حق اور باطل کو باطل کہے اس کو یہاں کوئی عزت اور مقبولیت حاصل نہیں ہوتی۔

یہ سب ایک ایسی دنیا میں ہو رہا ہے جو اپنی ذات میں بالکل بے عیب ہے۔ جہاں درخت کمال کا ایک انتہائی خوش منظر نمونہ بنے ہوئے کھڑے ہیں۔ جہاں چڑیاں اس کے سوا کوئی اور بولی نہیں جانتیں کہ وہ حسن اور سلامتی کے نغمے گائیں۔ جہاں سورج اور چاند صرف روشنی بکھیرتے ہیں، ان کو تاریکی بکھیرنا اور اندھیرا پھیلانا نہیں آتا جہاں ستارے صرف اپنے اپنے مدار میں گھومتے ہیں، کوئی ستارہ دوسرے کے مدار میں داخل ہو کر وہاں اپنا جھنڈا گاڑنے کے لئے نہیں دوڑتا۔

انسان اور بقیہ کائنات میں یہ تضاد دیکھ کر کچھ لوگوں نے کہا کہ یہاں دو خدا ہیں، ایک نور کا اور دوسرا ظلمت کا۔ کسی نے کہا کہ یہاں کوئی خدا ہی نہیں۔ اگر کوئی خدا ہوتا تو دنیا میں یہ الل ٹپ نظام کیوں کر جاری رہتا۔

مگر صحیح یہ ہے کہ موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ مثالی دنیا اس کے بعد آنے والی ہے اور انسان کے سوا بقیہ کائنات اسی کا ایک ابتدائی تعارف ہے۔ امتحان کا یہ لازمی تقاضا تھا کہ انسان کو عمل کی پوری آزادی ہو۔ اسی آزادی کا یہ نتیجہ ہے کہ کوئی شخص سیدھا راستہ اختیار کرتا ہے اور کچھ لوگ ٹیڑھے راستہ پر چلتے ہیں، مگر قیامت کے بعد جب مثالی دنیا قائم ہوگی تو وہاں وہی لوگ جگہ پائیں گے جنھوں نے موجودہ دنیا میں اس بات کا ثبوت دیا ہو گا کہ وہ مثالی انداز میں سوچنے اور مثالی کردار کے ساتھ زندگی گزارنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ بقیہ تمام لوگ چھانٹ کر اسی طرح دور پھینک دئے جائیں گے جیسے کوڑا کرکٹ سمیٹ کر پھینک دیا جاتا ہے۔

ایک شہر، دو کہانی

ستمبر ۱۹۸۲ میں ملک کے ایک شہر میں فساد ہوا۔ جانیں ضائع ہوئیں۔ دکان اور مکان جلا دیے گئے۔ تجارتوں اور صنعتوں کو تقریباً ایک ارب روپے کا نقصان پہنچا۔ اور ان تمام نقصانات میں ۹۰ فی صد سے زیادہ حصہ مسلمانوں کا تھا۔

مگر اسی شہر میں ایک مدرسہ ہر قسم کے نقصان سے بالکل محفوظ رہا۔ ایک ہی شہر میں دو قسم کے انجام کا راز صرف یہ تھا کہ شہر کے بقیہ مسلمانوں نے مقابلہ آرائی کی پالیسی پر عمل کیا اور مدرسہ والوں نے صبر کی پالیسی پر۔

یہ مدرسہ "دشمنوں" کے علاقہ میں تھا۔ وہ ہر طرف سے دشمنوں سے گھرا ہوا تھا۔ عین اس وقت جب کہ سارے شہر میں قیامت برپا تھی، ۱۱ ستمبر ۱۹۸۲ء کی رات کو دس بجے تقریباً پانچ سو آدمیوں کا غول آیا اور مدرسہ کو گھیر لیا۔ وہ لوگ نعرے لگا رہے تھے ——— مدرسہ میں آگ لگا دو، ایک کو بھی زندہ نہ چھوڑو وغیرہ۔ مدرسہ کے پاس ایک میدان میں کنکر پتھر کافی پڑے ہوئے تھے۔ یہاں سے اٹھا اٹھا کر ان لوگوں نے مدرسہ میں پتھر پھینکنے شروع کیے۔ ۸۔۱۰ آدمی مدرسہ کی چھت پر چڑھ گئے اور اوپر سے چیخنا شروع کیا۔

اس حالت میں مدرسہ والوں نے کیا کیا۔ جب انھوں نے دیکھا کہ فسادیوں کا غول ان کی طرف آرہا ہے تو پہلے سے سوچے ہوئے منصوبہ کے مطابق انھوں نے تمام روشنیاں بجھا دیں۔ حالات کے تحت انھیں قطعی اندیشہ تھا کہ فسادی ان کے اوپر حملہ کرنے آئیں گے۔ انھوں نے باہم مشورہ سے طے کیا تھا کہ جب ایسا ہوگا تو ہم مدرسہ میں بالکل اندھیرا کر دیں گے اور کمروں میں داخل ہو کر یہ آیت پڑھنا شروع کریں گے: لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَکَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ۔ ہم اس وقت تک کوئی جوابی کارروائی نہ کریں گے جب تک وہ بالکل ہمارے پاس نہ آجائیں۔

فسادیوں کا غول پتھر پھینک رہا تھا اور نعرے لگا رہا تھا اور مدرسہ کے تمام لوگ روشنیاں بجھا کر اپنے کمروں میں آیت قرآنی کا ورد کر رہے تھے۔ شہر کے عام مسلمانوں کے برعکس مدرسہ والوں کی اس خاموشی نے فسادیوں پر رعب ڈال دیا۔ انھوں نے سمجھا کہ یہ کوئی گہری سازش ہے اور انھوں نے کوئی خاص تیاری کر رکھی ہے جس کو وہ اس وقت سامنے لائیں گے جب کہ ہم لوگ اندر داخل ہو جائیں گے۔ چنانچہ مجمع کی طرف سے کچھ لوگوں نے پکار کر کہنا شروع کیا "واپس چلو، آگے نہ بڑھو، ورنہ تم میں سے کوئی بچ کر نہیں جائے گا" اس کے بعد چھت پر چڑھنے والے نیچے اتر آئے اور سارے کے سارے فسادی جدھر سے آئے تھے ادھر ہی واپس چلے گئے۔

تلوار سے زیادہ

سابق صدر مصر انور سادات (۱۹۸۱ - ۱۹۱۸) کے قتل کے بعد امریکہ کے ٹائم میگزین (۹ اکتوبر ۱۹۸۱) نے اس واقعہ کے بارے میں خصوصی مضمون شائع کیا تھا۔ اس مضمون کا آغاز اس نے نپولین کے ایک قول سے کیا۔ نپولین نے اپنے آخری زمانہ میں سوال کیا: "کیا تم جانتے ہو کہ دنیا کے بارے میں کیا چیز مجھے سب سے زیادہ تعجب میں ڈالتی ہے" اس کے بعد خود ہی جواب دیا کہ وہ چیز طاقت کی یہ بے بسی ہے کہ اس کے ذریعہ کسی چیز کو حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ بالآخر ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ دماغ تلوار کو فتح کر لیتا ہے:

In the end, the sword is always conquered by the mind

انور سادات نے مصر میں ہر قسم کی طاقت حاصل کر لی مگر ۶ اکتوبر ۱۹۸۱ کو وہ عین اس وقت قتل کر دئے گئے جب کہ قاہرہ میں وہ اپنی تمام افواج کے ساتھ فتح سوئز (۱۹۷۳) کی تقریب منا رہے تھے۔ انور سادات کی عالی شان نشست گاہ میں آنے والے تمام لوگوں کی جانچ مخصوص آلات (Metal Detector) کے ذریعہ کی جا رہی تھی حتیٰ کہ پریڈ میں حصہ لینے والے تمام فوجیوں کی رائفلوں کو کارتوس سے خالی کر دیا گیا تھا۔ مگر سادات کی فوج ہی کا ایک آدمی پریڈ سے نکل کر تیزی سے ڈائس کی طرف آیا اور قبل اس کے حفاظتی عملہ اس کو روکے وہ سادات کو اپنی گولی کا نشانہ بنا چکا تھا۔

یہ واقعہ تلوار کے اوپر دماغ کی فتح کا واقعہ تھا، انور سادات کے کچھ مخالفین نے یہ تصور پھیلایا کہ انور سادات مرتد ہو چکے ہیں اور شریعت اسلام کے مطابق مرتد شخص قتل کا مستوجب ہوتا ہے۔ یہ تصور فوج تک پہنچا۔ لفٹننٹ خالد استانبولی شدت کے ساتھ اس سے متاثر ہوا۔ اس نے اپنے چند ساتھیوں کی مدد سے خفیہ منصوبہ بنایا اور فتح کی پریڈ کے دن منصوبہ کے مطابق سادات کو گولی مار کر قتل کر دیا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ذہن تلوار سے زیادہ طاقت ور ہے۔ تاریخ میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ مگر تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ انسان نے اس ذہن کو زیادہ تر منفی مقاصد کے لئے استعمال کیا ہے۔ مثبت مقاصد کے لئے ذہن کو استعمال کرنے کی مثالیں تاریخ میں بہت کم پائی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر عمل کرنے والوں نے انسانیت کو صرف تخریب کا تحفہ دیا ہے۔ بہت کم عمل کرنے والے ہیں جن کے عمل سے انسانیت کو تعمیر کا تحفہ ملا ہو۔

وَمَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ؕ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرَ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿۶۱﴾ اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿۶۳﴾ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۶۴﴾ وَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ اِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ؕ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۶۵﴾

اور تم جس حال میں بھی ہو اور قرآن میں سے جو حصہ بھی سنا رہے ہو اور تم لوگ جو کام بھی کرتے ہو، ہم تمھارے اوپر گواہ رہتے ہیں جس وقت تم اس میں مشغول ہوتے ہو۔ اور تیرے رب سے ذرہ برابر بھی کوئی چیز غائب نہیں، نہ زمین میں اور نہ آسمان میں اور نہ اس سے چھوٹی اور نہ بڑی، مگر وہ ایک واضح کتاب میں ہے۔ سن لو، اللہ کے دوستوں کے لئے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور ڈرتے رہے، ان کے لئے خوش خبری ہے دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں، اللہ کی باتوں میں کوئی تبدیلی نہیں، یہی بڑی کامیابی ہے۔ اور تم کو ان کی بات غم میں نہ ڈالے۔ زور سب اللہ ہی کے لئے ہے، وہ سننے والا جاننے والا ہے ۶۱—۶۵

دعوت اس دنیا کے تمام کاموں میں مشکل ترین کام ہے۔ داعی اپنے پورے وجود کو دعوتی عمل میں شامل کرتا ہے، اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ کسی پیغام کا داعی بن سکے۔ اس سے بھی زیادہ سخت مرحلہ وہ ہے جو مخاطبین کی طرف سے پیش آتا ہے۔

داعی جب خدا کے دین کو بے آمیز صورت میں پیش کرتا ہے اور اس کو کھلے دلائل کی زبان میں مبرہن کر دیتا ہے تو وہ تمام لوگ بپھر اٹھتے ہیں جو خود ساختہ دین کو خدا کا دین بتا کر دیندار بنے ہوئے ہوں یا دینی پیشوائی کا مقام حاصل کئے ہوئے ہوں۔ وہ داعی کو زیر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بے بنیاد پروپیگنڈا، سازشیں، حتی کہ جارحانہ کارروائیاں، ہر چیز کو وہ اپنے لئے جائز کر لیتے ہیں۔ موجودہ دنیا میں ملی ہوئی آزادی انھیں موقع دیتی ہے اور وہ داعی کے خلاف جو کچھ کرنا چاہتے ہیں کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہ صورت حال یہاں تک پہنچتی ہے کہ دلیل کی طاقت تمام تر ایک طرف ہو جاتی ہے اور مادیات کی طاقت تمام تر دوسری طرف۔

یہ صورت حال بلاشبہ بے حد سخت ہے۔ اس کے بعد ایک طرف یہ ہوتا ہے کہ مخالفین حق کے حوصلے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ وہ اپنے کو کامیاب سمجھنے لگتے ہیں۔ دوسری طرف داعی پر بھی یہ خیال گزرتا ہے کہ کیا خدا اس معاملہ میں غیر جانب دار ہے۔ کیا وہ مجھے حق و باطل کے اس معرکہ میں ڈال کر خود علیٰحدہ ہو گیا ہے۔

مگر ایسا نہیں ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ خدا حق کا ساتھ نہ دے۔ مخالفین کا بے دلیل ہو جانا اور دلیل کی قوت کا تمام تر داعی کی طرف ہونا یہی اس بات کا ثبوت ہے کہ خدا داعی کے ساتھ ہے نہ کہ دوسرے گروہ کے ساتھ۔ کیونکہ دلیل موجودہ دنیا میں خدا کی نمائندہ ہے۔ جس کے ساتھ دلیل ہے اس کے ساتھ گویا خدا ہے۔ مخالفین حق کو جارحیت کا موقع صرف اس آزادی کی وجہ سے مل رہا ہے جو امتحان کی خاطر انھیں دی گئی ہے۔ امتحانی دنیا کے ختم ہوتے ہی یہ صورت حال بدل جائے گی۔ اس وقت عزت و برتری اس کے لئے ہو گی جو دلیل کی بنیاد پر کھڑا ہوا تھا۔ جو لوگ دلیل سے خالی تھے وہ وہاں کی دنیا میں رسوا اور ناکام ہو کر رہ جائیں گے۔ اللہ کے سچے داعیوں کا گروہ خدا کے دوستوں کا گروہ ہے۔ اللہ ان کو آخرت میں ایک ایسی اعلیٰ زندگی کی خوش خبری دیتا ہے جہاں نہ انھیں پچھلی زندگی کے لئے کوئی پچھتاوا ہو گا اور نہ اگلی زندگی کے لئے کوئی اندیشہ۔

اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِى الْاَرْضِ ؕ وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَآءَ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ۝٦٦ هُوَ الَّذِىْ جَعَلَ لَـكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ۝٦٧

سنو، جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں سب اللہ ہی کے ہیں۔ اور جو لوگ اللہ کے سوا شریکوں کو پکارتے ہیں وہ کس چیز کی پیروی کر رہے ہیں، وہ صرف گمان کی پیروی کر رہے ہیں اور وہ محض اٹکل دوڑا رہے ہیں۔ وہ اللہ ہی ہے جس نے تمھارے لئے رات بنائی تاکہ تم سکون حاصل کرو۔ اور دن کو روشن بنایا۔ بے شک اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو سنتے ہیں ۶۷ - ۶۶

زمین و آسمان کے پیچھے کون ہے جو اس کو سنبھالے ہوئے ہے اور اس کو چلا رہا ہے۔ یہ سوال ہر زمانہ میں انسان کی تلاش کا مرکزی نکتہ رہا ہے۔ مگر اس سوال کا صحیح جواب پانا اسی وقت ممکن ہے جب کہ آدمی ماورار طبیعیات دنیا تک دیکھ سکے اور ماورار طبیعیات تک دیکھنے والی آنکھ کسی کو حاصل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر وہ جواب جو وہ بطور خود قائم کرتا ہے وہ محض قیاس و گمان کی بنیاد پر ہوتا ہے نہ کہ

حقیقی علم کی بنیاد پر۔

اس دنیا میں حقیقی علم کی بنیاد پر بولنے والے صرف وہ لوگ ہیں جن کو پیغمبر کہا جاتا ہے۔ یہ وہ مخصوص لوگ ہیں جن کا ربط عالم بالا سے براہ راست قائم ہوتا ہے۔ خدا خود انھیں اپنی طرف سے حقیقت کی خبر دیتا ہے۔ اس لئے اس دنیا میں پیغمبر کا علم ہی واحد علم ہے جس پر یقینی طور پر بھروسہ کیا جاسکے۔

پیغمبروں کے دعوے کی صداقت کو جانچنے کے لئے اگرچہ ہمارے پاس کوئی براہ راست ذریعہ نہیں ہے۔ تاہم ایک بالواسطہ ذریعہ یقینی طور پر موجود ہے۔ اور وہ کائنات کی آیات (نشانیاں) ہیں۔ یہ نشانیاں پیغمبروں کے بیان کردہ معنوی حقائق کی عملی تصدیق کر رہی ہیں۔

مثال کے طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری زمین پر رات کے بعد دن آتا ہے اور دن کے بعد رات آتی ہے۔ یہ گردش ایک انتہائی محکم نظام کی وجہ سے وجود میں آتی ہے جو ریاضیاتی صحت کی حد تک منظم ہے۔ مزید یہ کہ یہ گردش حیرت ناک حد تک ہماری زندگی کے موافق ہے۔ اس کے پیچھے واضح طور پر ایک بامقصد منصوبہ کام کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ صورت حال یقینی طور پر ایک ایسے قادر مطلق اور رحمان ورحیم کے وجود کا ثبوت ہے جس کی خبر پیغمبر دیتے ہیں۔

جو لوگ اپنے خیال کے مطابق "شریکوں" کی پیروی کر رہے ہیں، وہ شرکاء خواہ قدیم الٰہیاتی شرکاء ہوں یا جدید مادی شرکاء، وہ کسی واقعی حقیقت کی پیروی نہیں کر رہے ہیں۔ بلکہ صرف اپنے قیاس وگمان کی پیروی کر رہے ہیں۔ پیغمبروں کے ذریعہ ظاہر ہونے والی حقیقت کی تصدیق ساری کائنات کر رہی ہے مگر "مشرکین" جس چیز کے مدعی ہیں اس کی تصدیق کرنے والا کوئی نہیں۔

قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ الْغَنِيُّ ؕ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ اِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍۭ بِهٰذَا ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۸﴾ قُلْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ؕ ﴿۶۹﴾ مَتَاعٌ فِي الدُّنْيَا ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نُذِيْقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِيْدَ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ﴿۷۰﴾

کہتے ہیں کہ اللہ نے بیٹا بنایا ہے۔ وہ پاک ہے، بے نیاز ہے۔ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ تمھارے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں۔ کیا تم اللہ پر ایسی بات گھڑتے ہو جس کا تم علم نہیں رکھتے۔ کہو، جو لوگ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں وہ فلاح نہیں پائیں گے۔ ان کے لئے بس دنیا میں تھوڑا فائدہ اٹھالینا ہے۔ پھر ہماری ہی طرف ان کا لوٹنا ہے۔ پھر ان کو ہم اس انکار کے بدلے سخت عذاب کا مزہ چکھائیں گے ۷۰ - ۶۸

خدا کے لئے بیٹے بیٹیاں ماننا خدا کو انسان کے اوپر قیاس کرنا ہے۔ انسان کمیوں اور محدودیتوں کا شکار ہے، اس لئے اس کو اولاد کی ضرورت ہے تاکہ ان کے ذریعہ وہ اپنی کمیوں اور محدودیتوں کی تلافی کرے مگر خدا کے معاملہ میں یہ قیاس بالکل بے بنیاد ہے۔

مخلوقات کا نظام خود ہی اس قسم کے خالق کی تردید ہے۔ مخلوقات کا عالمی نظام جس خدا کی شہادت دے رہا ہے وہ یقینی طور پر ایک ایسا خدا ہے جو اپنی ذات میں آخری حد تک کامل ہے۔ وہ ہر قسم کے عیبوں اور کمیوں سے پاک ہے۔ خدا اگر اپنی ذات میں کامل نہ ہوتا، اگر وہ عیبوں اور کمیوں والا خدا ہوتا تو کبھی وہ موجودہ کائنات جیسی کائنات کو نہیں بنا سکتا تھا اور نہ اس کو اس طرح چلا سکتا تھا جس طرح وہ انتہائی معیاری صورت میں چل رہی ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبر جس خدائے واحد کا تصور پیش کر رہا ہے اس کا وجود تو زمین و آسمان کی تمام نشانیوں سے ثابت ہے۔ مگر مشرکین نے خدا کا جو تصور بنا رکھا ہے، اس کا کوئی ثبوت موجودہ کائنات میں موجود نہیں۔ اب ظاہر ہے کہ بے ثبوت خدا کو ماننا خود ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ ایسے لوگ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ جو خدا سرے سے موجود نہ ہو وہ کیسے کسی کی مدد پر آئے گا اور کیسے کسی کو بامراد کرے گا۔ جو خدا حقیقی طور پر موجود ہے، مشرکین اس کو مانتے نہیں، اور جس خدا کو مانتے ہیں اس کا کہیں وجود نہیں۔ ایسی حالت میں مشرکین موجودہ کائنات میں کیونکر کامیاب ہو سکتے ہیں۔ ان کے لئے جو واحد انجام مقدر ہے وہ صرف یہ کہ بالآخر وہ بے بس اور بے سہارا ہو کر رہ جائیں اور ہمیشہ کے لئے ذلت و ناکامی میں پڑے رہیں۔

موجودہ دنیا میں انکار یا شرک کا رویہ اختیار کرنے سے کسی کا کچھ بگڑتا نہیں۔ اس سے آدمی غلط فہمی میں پڑ جاتا ہے۔ مگر موجودہ صورت حال صرف امتحان کی مہلت کی بنا پر ہے۔ موجودہ دنیا میں انسان کو امتحان کی وجہ سے عمل کی آزادی دی گئی ہے۔ جیسے ہی امتحان کی مدت ختم ہوگی موجودہ صورت حال بھی ختم ہو جائے گی۔ اس وقت آدمی دیکھے گا کہ اس کے پاس ان چیزوں میں سے کوئی چیز نہیں ہے جس کا وہ اپنے آپ کو مالک سمجھ کر سرکش بنا ہوا تھا۔

حدیث میں آیا ہے کہ اللہ نے عقل سے کہا: "اے عقل، اس کائنات میں میں نے تجھ سے افضل، تجھ سے حسین اور تجھ سے بہتر مخلوق پیدا نہیں کی۔" انسان کو ایسی عظیم نعمت دینے کا یہ تقاضا ہے کہ اس کی ذمہ داری بھی عظیم ہو۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کے نزدیک سچائی کا انکار سب سے بڑا جرم ہے۔ سچائی کو جب دلیل سے ثابت کر دیا جائے تو آدمی کے اوپر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ اس کو مانے۔ عقلی طور پر ثابت شدہ ہو جانے کے بعد اگر وہ سچائی کا انکار کرتا ہے تو وہ ناقابل معافی جرم کا ارتکاب کر رہا ہے۔ خدا نے جب انسان کو ایسی عقل دی جس سے وہ حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ہونا جان سکے تو اس کے بعد کیا چیز ہوگی جو خدا کے یہاں اس کے لئے عذر بن سکے۔

تضاد کی زمین پر

۱۹۷۷ کے الکشن میں کانگریس کو شکست ہوئی اور ہندستان میں جنتا پارٹی کی حکومت قائم ہوگئی۔ اس کے بعد ۱۹۷۹ میں ایک مسلمان کانگریسی لیڈر نے دہلی میں "ملت بچاؤ" کے نام پر "جیل بھرو" کی تحریک چلائی۔ انھوں نے اعلان کیا کہ جب تک ہماری مانگیں پوری نہ ہوں ہماری تحریک جاری رہے گی۔

جلد ہی جنتا پارٹی کی حکومت ختم ہوگئی اور کانگریس پارٹی کی حکومت دوبارہ قائم ہوگئی۔ ملت کے تمام مسائل اب بھی بدستور پوری شدت کے ساتھ موجود تھے۔ مگر جنتا حکومت کے خاتمہ کے ساتھ مذکورہ لیڈر کے مطالبات بھی ختم ہوگئے۔ جنتا پارٹی کے زمانہ میں جیل بھرو کی تحریک چلانے والے مجاہد نے کانگریس کی حکومت کے زمانہ میں راجیہ سبھا کی کرسی شکریہ کے ساتھ قبول کر لی۔

موجودہ زمانہ میں تمام مسلم لیڈر اسی قسم کے تضاد پر زندہ ہیں۔ ان کو جو لیڈری حاصل ہے وہ صرف ان کے تضاد کی قیمت ہے نہ کہ فی الواقع ان کی حق پرستی کی قیمت۔

ایک بزرگ ہندستان میں اس مہم کی قیادت کریں گے کہ کسی دینی ادارہ میں صدر کا بیٹا صدر نہ ہو۔ مگر عرب میں جاکر وہ اس پر راضی ہو جائیں گے کہ ایک بادشاہ کے بعد اس کا بیٹا ملک کا بادشاہ بنے۔ ایک قائد پاکستان میں عوامی جمہوریت کی تحریک چلائیں گے مگر پٹرو ڈالر کے دیس میں غیر جمہوری نظام کے ساتھ سازگاری کر لیں گے۔ ایک جماعت مصر اور شام میں "مکمل اسلام" سے کم کسی چیز پر راضی نہ ہوگی۔ مگر اسی جماعت کے افراد دولت مند عرب ممالک میں جزئی اسلام پر مطمئن ہو کر بڑے بڑے مشاہرے قبول کر لیں گے۔

یہی موجودہ زمانہ میں تمام اسلامی شخصیتوں اور مسلم جماعتوں کا حال ہے۔ وہ ایک مقام پر جس باطل کے خلاف جھنڈا اٹھانے کے چیمپین بنیں گے، دوسرے مقام پر اسی باطل کی موجودگی پر خاموش رہیں گے، صرف اس لئے کہ اس خاموشی کی قیمت ان کو اعزازات اور مفادات کی صورت میں مل رہی ہے۔

مگر ہمارے ان قائدین اور مفکرین کو جاننا چاہئے کہ تضاد کی زمین پر صرف شخصی عظمت کا محل کھڑا ہوتا ہے، ملت کی عظمت کا محل کبھی تضاد کی زمین پر کھڑا نہیں کیا جا سکتا۔

زبان والے بے زبان ہو جائیں گے

قدیم عرب میں ایک شخص جمیل بن معمر الجمحی تھا۔ وہ بہت ذہین آدمی تھا۔ اس کے اندر یہ عجیب صلاحیت تھی کہ وہ دو متضاد نقطہ نظر پر یکساں قدرت کے ساتھ تقریر کر سکتا تھا۔ چنانچہ اس کا نام ذوالقلبین (دو دل والا) پڑ گیا۔

اس قسم کے کردار مختلف شکلوں میں ہر زمانہ میں پائے گئے ہیں۔ مگر ذوالقلبین ہونا خدا کے مقرر کئے ہوئے فطری نقشہ سے انحراف کرنا ہے۔ یہ خدا کی دنیا میں ایک ناپسندیدہ چیز ہے نہ کہ کوئی پسندیدہ چیز۔ اسی لئے قرآن میں فرمایا گیا کہ اللہ نے کسی انسان کے دو دل نہیں بنایا (الاحزاب ۴) یعنی جب عضویاتی تخلیق میں انسان کو دو دل والا نہیں بنایا گیا ہے تو سوچ اور جذبات کے اعتبار سے بھی دو دل والا ہونا اس کے لئے صحیح نہیں ہو سکتا۔

موجودہ دنیا میں چونکہ انسان کو آزادی حاصل ہے اس لئے یہاں کوئی شخص ایسا کر سکتا ہے کہ وہ ایک معاملہ میں ایک طرز پر سوچے اور دوسرے معاملہ میں دوسرے طرز پر سوچے، وہ ایک مجمع میں ایک ڈھنگ پر بولے اور دوسرے مجمع میں دوسرے ڈھنگ پر تقریر کرے۔ وہ جسم کے اعتبار سے ایک دل والا انسان ہونے کے باوجود ذہن اور زبان کے اعتبار سے دو دل والا انسان بن کر رہے۔ بلکہ کئی دل والا انسان بن جائے۔ مگر ایسی ہر صورت خدا کے تخلیقی نقشہ کی خلاف ورزی ہے۔ وہ فطرت کے مقررہ راستہ سے انحراف کرنا ہے۔ موجودہ دارالامتحان میں کوئی شخص ایسا متضاد رویہ اختیار کر کے کامیاب ہو سکتا ہے مگر آخرت کی حقیقی اور معیاری دنیا میں اس قسم کا خلاف فطرت رویہ بالکل بے قیمت ہو کر رہ جائے گا۔

اس قسم کا انداز اختیار کرنے والا آدمی موجودہ دنیا میں خوب کامیاب رہتا ہے۔ وہ ہر طبقہ کے لوگوں سے ان کے حسب حال بات کرتا ہے۔ وہ جس سے ملتا ہے یا جہاں جاتا ہے، ہر جگہ وہی بات کہتا ہے جو وہاں کے لوگوں کی پسند کے مطابق ہو۔ مگر اس کی ہوشیاری صرف موجودہ دنیا میں کسی کے کام آ سکتی ہے۔ کیونکہ یہ دنیا سچائی کے ظہور کی دنیا نہیں۔ آخرت سچائی کے ظہور کی دنیا ہوگی۔ وہاں حق حق کی صورت میں اور باطل باطل کی صورت میں ظاہر ہو جائے گا۔ وہاں جمیل بن معمر الجمحی جیسے ماہرین بالکل بے قیمت ہو جائیں گے۔ وہ ساری مہارت کے باوجود ایسا محسوس کریں گے جیسے ان کے پاس زبان ہی نہیں جس سے وہ بولیں اور ان کے پاس قلم ہی نہیں جس سے وہ کچھ لکھ سکیں۔

اپنے کو تول لو اس سے پہلے کہ تمھیں تولا جائے

حضرت ثابت بن حجاج کہتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق نے کہا: اپنے آپ کو تول لو قبل اس کے کہ تمھیں تولا جائے۔ اپنا حساب کرلو قبل اس کے کہ تمھارا حساب کیا جائے کیونکہ کل کے حساب کے مقابلہ میں آج اپنا حساب کرلینا زیادہ آسان ہے اور بڑی پیشی کے لئے اپنے کو تیار کرلو (زنوا انفسکم قبل ان توزنوا وحاسبوها قبل ان تحاسبوا فانه اهون علیکم فی الحساب غداً ان تحاسبوا انفسکم وتنزینوا للعرض الاکبر، حلیۃ الاولیار لابی نعیم جلد ۱)

ایک نے مار کھائی، دوسرا بچ گیا

سالم بن ابی جعد کہتے ہیں کہ حضرت ابوالدرداء کے سامنے سے دو بیل گزرے جو ایک گاڑی میں جتے ہوئے تھے۔ ایک ان میں سے کام پر لگا رہا اور دوسرا رک گیا۔ یہ دیکھ کر حضرت ابوالدرداء نے کہا: اس میں بھی عبرت ہے۔ یعنی رکنے والے نے ڈنڈا کھایا اور دوسرا بچ گیا (مرّ ثوران علی ابی الدرداء وهما یعملان فقام احدهما ووقف الآخر فقال ابو الدرداء: ان فی هذا لمعتبرا، صفوۃ الصفوۃ جلد ۱)

سوچنا اور عبرت پکڑنا سب سے بڑا عمل ہے

حضرت عون بن عبداللہ بن عتبہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ام الدرداء سے پوچھا کہ حضرت ابوالدرداء کا اکثر عمل کیا ہوتا تھا۔ انھوں نے جواب دیا: سوچنا اور عبرت پکڑنا (قیل لام الدرداء ما کان اکثر عمل ابی الدرداء رضی اللہ عنہ قالت التفکر والاعتبار، حلیۃ الاولیار لابی نعیم جلد ۱)

صحابہ کرام کی عبادت خدا اور آخرت میں غور کرنا تھا

حضرت محمد بن واسع کہتے ہیں کہ حضرت ابوذر کی وفات کے بعد ایک شخص بصرہ سے سوار ہو کر مدینہ آیا اور ان کی اہلیہ ام ذر سے ملا تاکہ حضرت ابوذر کی عبادت کے بارے میں معلوم کرے۔ ام ذر نے کہا: وہ سارے دن تنہا غور وفکر کرتے رہتے تھے (ان رجلاً من البصرۃ رکب الی ام ذر رضی اللہ عنہا بعد وفاۃ ابی ذر رضی اللہ عنہ یسألها عن عبادۃ ابی ذر فاتاها فقال: جئتك لتخبرینی عن عبادۃ ابی ذر رضی اللہ عنہ، قالت: کان النهار اجمع خالیا یتفکر، حلیۃ الاولیار لابی نعیم جلد ۱)

ہر چیز میں عبرت اور نصیحت ہے

حضرت دارانی نے کہا کہ میں اپنے گھر سے نکلتا ہوں تو جس چیز پر بھی میری نگاہ پڑتی ہے مجھے اس میں خدا کی کوئی نعمت نظر آتی ہے اور میرے لئے کوئی عبرت ہوتی ہے (قال الدارانی: انی لاخرج من منزلی فما یقع بصری علی شیئ الا رأیت للہ علی فیه نعمة ولی فیه عبرۃ، تفسیر ابن کثیر)

ایک سفر

جمعیۃ الدعوۃ الاسلامیہ (لیبیا) کی دوسری عالمی کانفرنس ۱۴ - ۱۹ اگست ۱۹۸۲ کو طرابلس میں ہوئی۔ اس کانفرنس میں شرکت کے لیے مجھے مدعو کیا گیا تھا۔ اس سلسلے میں طرابلس کا سفر ہوا۔ ۱۳ اگست کو میں طرابلس پہنچا اور ۳۰ اگست تک وہاں قیام رہا۔ مولانا محمد ہاشم القاسمی بھی اس سفر میں میرے ساتھ تھے۔

جمعیۃ الدعوۃ الاسلامیہ کے تخیل اور اس کی سرگرمیوں کے بارے میں جو تعارفی کتاب ادارہ کی طرف سے شائع کی گئی ہے، اس کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں:

پہلی دعوتی کانفرنس جو طرابلس میں ۱۲ شوال ۱۳۹۰ھ مطابق ۱۰ دسمبر ۱۹۷۰ء کو ہوئی، اس کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ جمعیۃ الدعوۃ الاسلامیہ کا قیام عمل میں آیا تاکہ وہ خدا کی طرف اور اس کے سچے دین اسلام کی طرف دعوت دینے کے معاملات کو سنبھالے اور دین اسلام کو آباد دنیا کے تمام لوگوں تک پہنچائے۔ یہ ایک فرض ہے جو مسلمانوں کے کندھوں پر ان کے بھائیوں کے حق میں ڈالا گیا ہے۔ یہ اسلامی دعوت کی ادائگی ہے جس کی امت اسلامیہ مکلف ہے جو کہ خیر امت ہے اور لوگوں کے لئے نکالی گئی ہے تاکہ وہ انسان کی خدمت کرے جو حیرت کے اندھیروں میں گم ہے اور اسلام کا محتاج ہے۔ اس امت کی ذمہ داری ہے کہ وہ انسانیت کو حیرانگی اور گمراہی سے نکالے اور اس کو صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کرے اور اس کی مشکلات کو حل کرے اور اس کو اس سعادت سے ہم کنار کرے جس کو دنیا کے تمام نظام فراہم کرنے سے عاجز رہے ہیں (عربی سے ترجمہ)

جمعیۃ الدعوۃ الاسلامیہ کے موجودہ ذمہ دار (امین) دکتور محمد احمد الشریف ہیں۔ اس ادارہ کے مقاصد میں سے خاص مقاصد یہ ہیں —— داعی اور استاد تیار کرنا، اسلامی دعوت کے اداروں کو تعاون دینا، قرآن اور دوسری اسلامی کتابیں شائع کرنا۔ جمعیۃ الدعوۃ الاسلامیہ نے افریقہ، ایشیا، یورپ، امریکہ اور آسٹریلیا میں تقریباً ساڑھے تین سو داعی اور اساتذہ بھیجے ہیں۔ ان لوگوں نے مختلف ملکوں میں، ہزاروں آدمیوں کو اسلام میں داخل کیا ہے۔ جمعیۃ الدعوۃ نے مختلف ممالک میں مسجدیں اور اسلامی مراکز قائم کئے ہیں اور ایک سو سے زیادہ اسلامی اداروں کو گراں قدر امداد فراہم کی ہے، بڑی تعداد میں اسلامی کتابیں چھاپ کر ساری دنیا میں تقسیم کی گئی ہیں۔ وغیرہ

جمعیۃ الدعوۃ کے تحت ۱۹۷۴ میں ایک تربیتی کالج قائم کیا گیا جس کا نام کلیۃ الدعوۃ الاسلامیہ ہے۔

یہ ادارہ طرابلس میں قائم ہے اور اپنی وسعت کے اعتبار سے ایک یونیورسٹی کا درجہ رکھتا ہے۔ اس ادارہ کا مقصد یہ ہے کہ مسلم نوجوانوں کو اسلام کے ماضی اور حال سے واقف کرایا جائے۔ اسلام کی فکری عظمت اور اس کی عملی افادیت ان کے ذہن پر بٹھائی جائے۔ ایسے داعی تیار کئے جائیں جو دنیا کے مختلف حصوں میں اسلام کی دعوت کا کام کریں۔ اس کلیہ میں تعلیم کی مدت چار سال ہے اور اس میں ایم اے اور ڈاکٹریٹ کے درجہ تک کی ڈگریاں دی جاتی ہیں۔ اس کا نصاب کلیہ کے مطبوعہ پمفلٹ کے مطابق حسب ذیل مضامین پر مشتمل ہے:

التفسیر وعلوم القرآن، الحدیث وعلوم السنہ، الفقہ الاسلامی، تاریخ التشریع الاسلامی، التاریخ الاسلامی، الاستشراق والتبشیر، حاضر العالم الاسلامی، علم النفس العام، علم الاجتماع، الادیان دمقارنتہا، الفرق الاسلامیہ، التیارات الفکریہ المعاصرہ، التصوف وتاریخہ، علم الاخلاق، الحضارۃ الاسلامیہ، الفلسفۃ الاسلامیہ، علم النفس الاجتماعی، اللغات الاوروبیہ، اللغات الشرقیہ

ہندستان اور طرابلس کے درمیان چھ ہزار کیلومیٹر کا فاصلہ ہے۔ ہندستان میں "طرابلس" کا لفظ غالباً سب سے پہلے ۱۹۱۱ میں عام ہوا جب کہ اٹلی کی ۲۵ سالہ حکومت نے اپنے اقتدار کو بچانے کے لئے لیبی عوام پر مظالم کئے۔ اس وقت ہندستان کے اخبارات نے مضامین لکھے اور شاعروں نے نظمیں کہیں۔ اسی زمانہ میں اقبال نے اپنی مشہور نظم کہی تھی اس کے دو اشعار یہ تھے:

مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں

جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

میں طرابلس ایسے موقع پر پہنچا جب کہ لبنان میں فلسطینی مسلمانوں کے اوپر اسرائیل کے وحشیانہ مظالم (۱۹۸۲) جاری تھے۔ اس کے بعد جس طرح ذلت کے ساتھ فلسطینیوں کو لبنان چھوڑنا پڑا، اس کی چیخ و پکار سے تمام عرب اخبارات بھرے ہوئے نظر آئے۔ اگر مذکورہ تقابل کو دیکھا جائے تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ملت اسلامیہ نے ۱۹۱۱ سے لے کر ۱۹۸۲ تک آگے کی طرف سفر طے نہیں کیا۔ ملت اسلامیہ ستر سال پہلے جس طرح ظالموں کے مقابلہ میں بے بس تھی۔ اسی طرح وہ ستر سال بعد بھی ظالموں کے مقابلہ میں بے بس ہے —— جس ملت کے لئے دور اول میں غلبہ مقدر کیا گیا تھا، کیا بعد کے دور میں اس کے لئے مظلومیت اور مغلوبیت مقدر کردی گئی ہے۔

دہلی سے لیبیا کے لئے ابھی تک براہ راست ہوائی سروس نہیں ہے۔ ہم نے دہلی سے ایتھنز تک ڈچ ہوائی کمپنی (KLM) کے ذریعہ سفر کیا اور ایتھنز سے طرابلس کے لئے اولمپک ایرویز کے ذریعہ۔

۱۳/ اگست کو ایک دن ایتھنز (یونان) میں قیام رہا۔ یونان کی زمین پر یہ مختصر قیام بڑا عبرت انگیز تھا۔ اس کو دیکھ کر خیال آیا کہ یہی وہ مقام ہے جہاں دور قدیم کے بڑے بڑے حکماء اور فلاسفر پیدا ہوئے۔ اسپین کے بعد یہ دوسرا مقام ہے جہاں سے اسلام نے "مغرب" کی طرف پیش قدمی کی تھی۔ مگر آج انھیں راستوں سے "مغرب" اسلامی دنیا میں داخل ہو رہا ہے۔ بلکہ اس کو اپنے نفوذ کے لئے قدیم روایتی راستوں کی ضرورت نہیں۔ وہ بے شمار نئے راستوں سے اس طرح عالم اسلام میں گھس رہا ہے کہ اس پر قرآن کے یہ الفاظ صادق آتے ہیں ۔۔۔ وھم من کل حدب ینسلون

۱۳ اگست کو جب کہ ہم طرابلس سے بہت دور ایک غیر ملک (یونان) میں تھے۔ ہوائی اڈہ کی ایک خاتون آئیں اور ہمارا تعارف حاصل کرنے کے بعد ہم کو خوش آمدید کہا۔ ان کو حکومت لیبیا کی طرف سے ٹیلکس پر ہدایت دی گئی تھی کہ وہ ہم سے ملیں اور ہماری مدد کریں۔ چنانچہ وہ ہم کو عام ہوائی مسافروں کی صف سے نکال کر ایک خصوصی مہمان خانہ میں لے گئیں۔ یہاں کھانے اور دوسری ضروریات کا اعلیٰ انتظام تھا۔ جب اگلے جہاز کا وقت آیا تو خاتون دوبارہ آئیں اور عام مسافروں سے الگ ایک خصوصی گاڑی پر سوار کر کے ہم کو طرابلس جانے والے جہاز تک پہنچایا۔

یہ منظر دیکھ کر مجھے آخرت کا معاملہ یاد آ گیا۔ جنت میں کسی آدمی کا داخلہ اگرچہ حشر میں حساب کتاب کے بعد ہوگا۔ مگر حدیث میں بتایا گیا ہے کہ آدمی کا اخروی انجام اس کی موت کے بعد ہی شروع ہو جاتا ہے۔ اس پر کچھ لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ جب آدمی کے ابدی انجام کا فیصلہ قیامت کے بعد ہوگا تو قیامت سے پہلے کسی آدمی کے لئے اس کا تجربہ کیسے ممکن ہے۔ مذکورہ واقعہ تمثیلی انداز میں اس کا ایک جواب ہے ــــ ہماری میزبانی کا اصل مقام اگرچہ براعظم افریقہ کے ایک ملک (لیبیا) میں تھا۔ مگر چونکہ یہ سرکاری میزبانی تھی اس لئے اس کا آغاز بہت پہلے براعظم یورپ کے ایک ملک (یونان) سے شروع ہو گیا جب کہ ابھی ہم میزبان ملک کی سرحد میں داخل بھی نہیں ہوئے تھے۔

طرابلس میں ایک روز میں اپنے ہوٹل کے کمرہ میں تھا کہ دروازہ باہر سے مقفل ہو گیا۔ یہ کمرے اس طرح بنائے گئے ہیں کہ نہ باہر کی آواز اندر آئے اور نہ اندر کی آواز باہر جائے۔ ایسی حالت میں دروازہ کو دوبارہ کھلوانے کے لئے مجھے کافی شور وغل کرنا ہوتا۔ مگر مجھے سادہ طور پر صرف یہ کرنا پڑا کہ میں نے انٹرکام پر نمبر 17 کو ڈائل کیا۔ اُدھر سے ہلو کی آواز آئی تو میں نے بتایا کہ میں کمرہ نمبر 48 11 میں ہوں اور میرا کمرہ باہر سے مقفل ہو گیا ہے۔ چنانچہ ایک منٹ میں ہوٹل کا آدمی آیا اور اس نے دروازہ کھول دیا۔ ان کے پاس ماسٹر کی ہوتی ہے جس کے ذریعہ وہ ایک ہی کنجی سے پوری منزل کے تمام دروازے کھول سکتے

Ladies and Gentlemen

I am very thankful to you for according me the honour of presiding over this international assembly of Muslim scholars and preachers. May God help us to carry out His will.

First, I congratulate the Govt. of Libya, Dr M.A. Sharief, and other members of the *Jamiat Ad-Dawah Al-Islamia* for affording us the opportunity of having Muslims from all over the world under one roof, discussing matters of Islamic *Dawah*.

The most obvious lesson of this universal gathering of Muslims is that Islamic *Dawah* is the most certain base of unity among Muslims. *Dawah* is the only issue about which there is no controversy among different sects of Muslims; moreover, this is the only field of work where we can enjoy the cooperation of the Muslim rulers of our day. This great conference of Islamic Call is an incontrovertible proof of this.

Let us avail of this opportunity and open a new page of our history, one of unity, of joint effort, and of result-oriented struggle. May Allah bless you and bestow upon you the wisdom which leads to ultimate success and salvation.

Finally, I would request all the learned speakers to observe the time limit (for speech) and in this too, set an example of Islamic discipline.

Now I request Shaikh Dr Mostafa Al-Hamshary to carry on the proceedings.

Presidential address delivered by Maulana Wahiduddin Khan at the second Islamic Conference, Tripoli 15th August 1982

ہیں ــــــ جہاں لوگوں کے پاس صرف اپنے اپنے تالے کی کنجیاں ہوں وہاں لوگ اکثر یہ حقیقت بھول جاتے ہیں کہ کوئی ایسی شاہ کلید بھی ہو سکتی ہے جس کے ذریعہ ان کے اپنے تالے سمیت تمام تالوں کو کھولا جا سکے۔

ہندستان میں "بائیں چلو" کا اصول ہے اور لیبیا میں "دائیں چلو" کا اصول۔ نئی دہلی کا کوئی آدمی ایسا نہیں کرے گا کہ وہ طرابلس کی سڑک پر "بائیں چلو" کے اصول پر اپنی گاڑی دوڑانے لگے۔ اسی طرح طرابلس کا ایک آدمی کبھی ایسا نہیں کر سکتا کہ وہ نئی دہلی کی سڑک پر "دائیں چلو" کے اصول پر عمل کرے اور اپنی گاڑی لے کر دائیں رخ پر دوڑنے لگے۔ سڑکوں کے بارے میں ہر آدمی اس قانون کو جانتا ہے مگر زندگی کے معاملہ میں ہر آدمی اس اصول کو بھول جاتا ہے۔ یہاں ہر آدمی اس خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ اسے کسی "خارجی قانون" کی پابندی کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنے ذوق کے مطابق خواہ دائیں طرف اپنی زندگی کی گاڑی دوڑائے یا بائیں طرف۔

کانفرنس کا افتتاح ۱۴ اگست کی شام کو ہوا۔ اس کے بعد پانچ روز تک باقاعدہ کارروائی جاری رہی۔ ہر روز کا اجلاس کسی خاص آدمی کی صدارت میں ہوا۔ ایک دن (۱۵ اگست) کی نشست کے لئے راقم الحروف کو صدر جلسہ (یہاں کی اصطلاح میں امین جلسہ) بنایا گیا۔ میں نے اپنی صدارتی تقریر انگریزی میں کی اور اس میں چند باتیں کہیں۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ اس وقت دنیا بھر کے مسلمان یہاں ایک چھت کے نیچے جمع ہیں۔ ان کو جس چیز نے یکجا کیا ہے وہ اسلامی دعوت ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلامی دعوت ایک ایسا عنوان ہے جس پر تمام مسلمانوں کا اتحاد ہو سکتا ہے۔ پھر کیوں ہم ان عنوانات پر زور آزمائی کریں جن میں مسلمان ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں۔ اس کے بجائے ہم کو دعوت کے مقصد کو لے کر آگے بڑھنا چاہیے جو اتحاد و اتفاق پیدا کرتا ہے اور اتحاد و اتفاق بلاشبہ سب سے بڑی قوت ہے۔

کانفرنس کی کارروائی چھ دن جاری رہی۔ پروگرام کی تفصیل مطبوعہ نقشہ کے مطابق حسب ذیل تھی:

۱۴ اگست	الافتتاح
۱۵ اگست	الدعوة الاسلامیہ فی عالمنا المعاصر
۱۶ اگست	الدعوة الاسلامیہ ومشکلات المسلمین
۱۷ اگست	قضیة الحریہ فی العالم الاسلامی
۱۸ اگست	الاسلام وتحدیات العصر
۱۹ اگست	بیان المؤتمر والتوصیات الختامیہ

آخری دن کی کارروائی میں اتفاق رائے سے اسلامی دعوت کا کام انجام دینے کے لئے مختلف ملکوں سے ایک عالمی کونسل (مجلس عالمی للدعوۃ الاسلامیہ) بنائی گئی جو اس مؤتمر عام کے لئے مجلس تنفیذی کے طور پر کام کرے گی۔ اس کونسل میں راقم الحروف کا نام شامل کرنے کا اعلان کیا گیا۔ اس عالمی کونسل کا ہر سال کم از کم ایک اجلاس طرابلس میں ہوا کرے گا۔ اس کے ممبران کی مجموعی تعداد ۳۶ ہے۔

۱۶ اگست ۱۹۸۲ء کو میرا مقالہ تھا۔ میرے مقالہ کے ساتھ عجیب قصہ پیش آیا۔ طرابلس کے سفر سے پہلے مجھے لندن کا سفر کرنا پڑا۔ وہاں سے واپسی کے فوراً بعد طرابلس کے لئے روانگی تھی۔ اس ہنگامی صورت حال کی وجہ سے طرابلس کی کانفرنس کے لئے کوئی مستقل مقالہ تیار کرنے کا موقع نہ تھا۔ لندن کے سفر پر جاتے ہوئے میں نے برادرم مولانا محسن عثمانی ندوی ایم اے کو اپنی مطبوعہ کتاب الاسلام یتحدی دی اور ان سے کہا کہ اس سے معلومات لے کر ایک مقالہ تیار کر دیں۔ انھوں نے مقالہ تیار کیا اور وہ ہندستان کے لیبی سفارت خانہ کی معرفت طرابلس پہنچ کر وہاں سائیکلو اسٹائل بھی ہو گیا۔

میں اسی مقالہ کو لے کر طرابلس پہنچا اور ذہن میں یہ تھا کہ اسی کو وہاں کی کانفرنس میں پڑھنا ہے۔ اس درمیان میں ایسا ہوا کہ میں نے ایک امریکی نومسلم کو ایک دن پہلے یہ مقالہ پڑھنے کے لئے دیا جو عربی زبان اچھی طرح جانتے تھے۔ انھوں نے پڑھنے کے بعد کہا کہ یہ تو آپ کی کتاب الاسلام یتحدی کا خلاصہ ہے۔ اس کے بعد معلوم ہوا کہ تقریباً پانچ سو آدمی جو مقالہ پڑھتے وقت ہال میں موجود ہوں گے ان میں سے بیشتر الاسلام یتحدی کو پڑھ چکے ہیں۔ وہ یقینی طور پر محسوس کریں گے کہ وہی پچھلی بات ان کے سامنے دہرا دی گئی ہے۔

یہ خبر میرے لئے بڑی سخت تھی۔ کیونکہ اگلے ہی دن مقالہ پڑھا جانے والا تھا اور درمیان میں صرف ایک رات کا موقع تھا۔ بہرحال میں نے اللہ کے بھروسہ پر ایک نیا فیصلہ کیا۔ میں نے طے کیا کہ میں ایک نیا مقالہ تیار کروں گا۔ میں نے ذمہ داروں سے نیا مقالہ پڑھے جانے کی اجازت لی۔ اس کے بعد ایک مصری نوجوان کو معاونت کے لئے تیار کیا۔ یہ تھے:

محمد سعید مراد۔ ۱۲ شارع سعید، متفرع من شارع طومان بای۔ حلمیۃ الزیتون۔ القاہرہ

طے شدہ پروگرام کے مطابق ہم دونوں فندق باب البحر (طرابلس) کی گیارھویں منزل پر کمرہ نمبر ۱۱۴۸ میں عشاء کی نماز پڑھ کر بیٹھے۔ طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ مقالہ کا مضمون میں اپنی ہندستانی عربی میں کہتا اور کبھی کبھی انگریزی میں اس کی تشریح کرتا۔ اس کے بعد محمد سعید مراد مصری اس کو اپنی فصیح عربی میں لکھتے۔ یہ سلسلہ ساری رات جاری رہا۔ یہاں تک کہ جب فجر کی اذان ہوئی تو ہمارا مقالہ تیار ہو چکا تھا۔ اگلے دن دوپہر بعد کی نشست میں اس کو پڑھنا تھا۔ اس وقت تک سائیکلو اسٹائل ہو کر اس کی کاپیاں بھی تیار ہو گئیں۔

آدھ گھنٹہ کے اس مقالہ کا عنوان تھا "القرآن فی مواجہۃ التحدیات العصریۃ"۔ مقالہ پیش کرنے کے بعد جو ملاقاتیں ہوئیں ان سے اندازہ ہوا کہ لوگوں نے اس کو غیر معمولی طور پر پسند کیا۔ کسی نے کہا: واللہ اسلوب فریدا۔ کسی نے کہا: کان ممتازا جدا۔ کسی نے کہا: لقد اعجبنی کثیرا۔ وغیرہ۔ یہ عربی مقالہ اولاً موتمر کی طرف سے سائیکلو اسٹائل کرایا گیا تھا۔ اس کے بعد وزیر اطلاعات عبد الرحمٰن شلقم کی خصوصی ہدایت کے تحت فوری طور پر اس کو پمفلٹ کی صورت میں شائع کیا گیا۔ موتمر میں پڑھے جانے والے مقالات میں راقم الحروف کا مقالہ واحد مقالہ تھا جس کو اس طرح پمفلٹ کی صورت میں چھاپا گیا۔

آدھ گھنٹہ کے مقالہ میں میں نے یہ دکھایا کہ جدید تحدیات دراصل جدید امکانیات ہیں۔ اگر ان کو قرآن کی رہنمائی میں استعمال کیا جائے تو وہ ہمارے لئے نیا مستقبل پیدا کرنے کا زینہ بن سکتے ہیں۔ آخری پیراگراف یہ تھا:

"رسول اور اصحاب رسول کے زمانہ میں بظاہر اسلام کو العدو القوی سے معاملہ پیش آیا۔ مگر اس العدو القوی کے اندر حقیقۃً المومن القوی کے امکانات چھپے ہوئے تھے۔ اسی طرح موجودہ زمانہ میں اگرچہ ہم کو سخت ترین حالات کا سامنا ہے مگر یہ حالات اسلام کے لئے زینے ہیں۔ اگر ہم قرآن کو لے کر اٹھ جائیں تو تاریخ دوبارہ ثابت کرے گی کہ یہ ساتویں صدی ہجری کی مانند گویا ایک تاتاری تلوار تھی جو صرف اس لئے ظاہر ہوئی تھی کہ بالآخر خدا کے دین کی خدمت و حمایت کے لئے وقف ہو جائے۔"

ایک صاحب امریکہ سے آئے تھے۔ عربی اور انگریزی دونوں زبانیں یکساں روانی کے ساتھ بولتے تھے۔ کھانے کی میز پر ان کا ساتھ ہو گیا۔ بات چیت کے دوران انھوں نے میرا نام پوچھا۔ میں نے کہا "وحید الدین"۔ انھوں نے کہا "وحید الدین خان"۔ میں نے کہا ہاں۔ اس کے بعد وہ بڑے زور کے ساتھ لپٹ گئے۔ وہ میری عربی کتابیں پڑھے ہوئے تھے۔ اسی طرح کا واقعہ اکثر لوگوں کے ساتھ پیش آیا۔ عربی کتابیں، خاص طور پر الاسلام یتحدیٰ، بار بار چھپ کر تقریباً پوری مسلم دنیا میں پھیلی ہے اور تعلیم یافتہ طبقہ عام طور پر اس کو پڑھ چکا ہے۔ یہاں اگرچہ دنیا کے مختلف حصوں کے لوگ تھے، تقریباً سارے ہی لوگ الاسلام یتحدی کو پڑھے ہوئے نظر آئے۔ ایسے لوگ بھی ملے جنھوں نے کہا کہ الاسلام یتحدیٰ ابھی میں نے پڑھی نہیں ہے مگر اس کا نام کافی سنا ہے اور پڑھنے کا اشتیاق ہے۔

مزید معلوم ہوا کہ الاسلام یتحدی (مذہب اور جدید چیلنج) کا ترجمہ عربی کے علاوہ اور کئی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ مثلاً یوگوسلاویہ کے ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ ایک ماہوار رسالہ (Edukata Islame) نکالتے ہیں۔ یہ رسالہ یوگوسلاویہ کی البانوی زبان میں ہے۔ انھوں نے اس یوگوسلاوی زبان میں الاسلام یتحدی

کا ترجمہ کیا ہے۔ فی الحال اس کو انھوں نے اپنے رسالہ کے نمبر کے طور پر شائع کیا ہے اور آئندہ کتابی صورت میں چھاپنے والے ہیں۔ ان کا نام و پتہ یہ ہے :

Mr Sherif Ahmad, direktor medrese Alauddin
P. F. 89, Pristina, Yugoslavia

اس طرح ہماری معلومات کے مطابق یہ کتاب اردو کے علاوہ عربی، ترکی، فرانسیسی اور یوگوسلاوی زبانوں میں شائع ہو چکی ہے۔

الاسلام یتحدی عرب دنیا میں اس قدر مقبول ہوئی ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر تعلیم یافتہ آدمی اس سے باخبر ہے اور اس سے غیر معمولی طور پر متاثر ہے۔ اکثر ایسا ہوا کہ کسی سے پوچھا گیا کہ آپ نے الاسلام یتحدی پڑھی ہے، اس کا جواب یہ ہوتا تھا : عدۃ مرات (کئی بار)

ہماری معلومات کے مطابق، الاسلام یتحدی اب تک پانچ عرب ملکوں کی جامعات میں باقاعدہ طور پر داخل نصاب ہو چکی ہے ــــــــ قاہرہ، طرابلس، قطر، خرطوم اور تیونس۔ یہاں آنے والوں کے ذریعہ معلوم ہوا کہ کئی عرب یونیورسٹیوں اور کالجوں میں اساتذہ مستقل طور پر اس سے استفادہ کرتے ہیں اور اس کے مضامین کو اپنے لکچروں میں استعمال کرتے ہیں۔ مگر جہاں تک راقم الحروف کا علم ہے، ہندستان اور پاکستان کی کسی بھی درس گاہ کے نصاب میں اب تک وہ داخل نہ کی جاسکی۔ ہمارے قائدین اور ہمارے مدارس کے ذمہ دار یہ اعلان تو بار بار کرتے رہتے ہیں کہ "معقولات اور علم کلام پر جدید انداز میں کتاب لکھنے کی ضرورت ہے"۔ مگر جب ایسی کتاب لکھ کر شائع کر دی جائے تو ان کے اندر یہ جذبہ نہیں ابھرتا کہ اس کو اپنائیں اور عملاً اس کو استعمال کریں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا ہر آدمی صرف کہنے کا کریڈٹ لینا چاہتا ہے، عمل کا کریڈٹ لینے کا شوق کسی کے اندر نہیں۔

طرابلس میں الاسلام یتحدی سے متعلق ایک عجیب کہانی معلوم ہوئی۔ طرابلس میں محمد سلیمان القائد اور علی مختار الجعیدی ہمارے دعوتی مشن سے بہت متاثر ہیں۔ ۱۹۷۷ میں وہ ڈاکٹر عبداللہ الصونی (رئیس قسم اللغۃ العربیۃ، کلیۃ التربیۃ، جامعہ طرابلس) سے ملے اور ان سے کہا کہ اسلامی مرکز کے لئے آپ تعاون دیجئے۔ وہ مذکورہ لیبی نوجوانوں کے قریبی ملاقاتی تھے۔ انھوں نے کہا خدا کی قسم میں تو ایک غریب آدمی ہوں (واللہ انا مفلس)

عبداللہ الصونی کے پاس واقعتہً مال نہ تھا۔ تاہم وہ ایک شریف آدمی تھے۔ رات کو جب وہ بستر پر لیٹے تو ان کے دل نے انھیں ملامت کی کہ تمھارا دوست تم سے ایک نیک کام میں مدد لینے کے لئے آیا اور

تم اس کی کچھ مدد نہ کرسکے۔ یہ احساس ان پر اس قدر غالب آیا کہ وہ رات کو ٹھیک سے سو نہ سکے۔

اس کے بعد ایک عجیب واقعہ ہوا۔ ان کے احتساب خویش نے ان کے سامنے ایک نیا وسیع تر دروازہ کھول دیا۔ وہ "الاسلام یتحدیٰ" کو پڑھے ہوئے تھے اور اس کی اہمیت کے معترف تھے۔ انھوں نے سوچا کہ اگرچہ میرے پاس مال نہیں ہے اور مال کے ذریعہ میں اس دینی مشن کی مدد نہیں کرسکتا۔ مگر میں ایک تعلیمی ادارہ کا صدر ہوں اور میں ایسا کرسکتا ہوں کہ الاسلام یتحدیٰ کو اپنے یہاں تعلیمی نصاب میں داخل کردوں۔

اگلی صبح کو وہ خود مذکورہ لیبی نوجوان کے گھر پہنچے اور اس سے کہا کہ میں نے تمھارے مشن کی مدد کے لئے ایک اور راستہ پالیا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے بتایا کہ میں نے تمھارے مشن کے تحت شائع شدہ کتاب (الاسلام یتحدیٰ) کو یونیورسٹی کے نصاب میں داخل کردیا ہے۔ اسی وقت انھوں نے کتاب کے پانچ ہزار نسخوں کا آرڈر لکھ محمد سلیمان القائد کے حوالے کیا اور کہا کہ اس کی فراہمی کا فوراً انتظام کریں۔ چنانچہ کتاب بہت جلد قاہرہ سے منگالی گئی۔

اس کے بعد اگلے چند سالوں میں مزید کتابیں منگائی گئیں۔ اندازہ ہے کہ اس کے بعد مجموعی طور پر تقریباً پچاس ہزار کتابیں لیبیا میں پہنچیں۔ اس کی قیمت مصری سکہ میں ۵۰ قرش تھی جو لیبیا میں بشکل ۵۰ پیسہ کے بقدر ہے۔ چنانچہ طلبا اور غیر طلبا نے کثرت سے خریدا۔ لیبیا اگرچہ رقبہ کے اعتبار سے بڑا ملک ہے۔ مگر اس کی آبادی بہت تھوڑی ہے۔ چنانچہ چند سالوں کے اندر ایسا ہوا کہ الاسلام یتحدیٰ لیبیا کے تقریباً ہر پڑھے لکھے آدمی تک پہنچ گئی۔

لیبیا نیز دوسرے ملکوں کے کئی صحافی حضرات نے انٹرویو لیا۔ ان کے سوالات میں دو سوال بہت مشترک ہوتے تھے۔ ایک یہ کہ آپ نے الاسلام یتحدیٰ کے بعد اور کیا کیا تحریری کام کئے ہیں۔ میں نے بتایا کہ اس کے بعد کافی تحریری کام ہوچکا ہے مگر عربی میں ان کے ترجمہ اور اشاعت کا کام ابھی باقی ہے۔ دوسرا سوال جو تقریباً ہر اخبار یا رسالہ والے نے کیا وہ یہ کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کو جو مشکلات و مسائل درپیش ہیں ان کا آپ کے نزدیک کیا حل ہے۔ میں نے سب کو ایک ہی جواب دیا۔ وہ یہ کہ تمام مسائل کا ایک ہی یقینی حل دعوت الی اللہ ہے۔ دوسرا کوئی حل نہ اب تک کامیاب ہوا ہے اور نہ آئندہ کامیاب ہوسکتا ہے۔

۲۳ اگست کو طرابلس کے ٹیلی وژن پر میرا ایک انٹرویو نشر کیا گیا۔ اس طرح کا انٹرویو عام طور پر ۱۵ منٹ کا ہوتا ہے مگر میرا انٹرویو خاص طور پر ایک گھنٹہ تک جاری رہا۔ سوالات زیادہ تر دو چیزوں سے متعلق تھے۔ ایک یہ کہ آپ کے مرکز اسلامی کے تحت کیا کیا کام ہو رہے ہیں۔ دوسرے یہ کہ جدید تحدیات کے مقابلہ میں آپ کے نزدیک اسلام کا موقف کیا ہونا چاہئے۔

چودہ منزلہ فندق باب البحر کی بالکنی پر کھڑے ہو کر طرابلس کے شہر پر نظر ڈالیں تو وہ خشک عمارتوں کا ایک پتھریلا جنگل معلوم ہوتا ہے۔ نئی دہلی جیسے سبزہ اور درخت کا یہاں کوئی تصور نہیں۔ ہوٹل میں چاروں طرف کثرت سے ہرے بھرے درخت اور پودے نظر آئے۔ ہم سمجھے کہ یہ ہمارے ملک کی طرح واقعی درخت اور پودے ہیں۔ مگر قریب جاکر گہرائی کے ساتھ مشاہدہ کیا تو وہ سب پلاسٹک کے بنے ہوئے تھے۔ مگر ڈنٹھل اور پتی اور پھول، ہر چیز میں اتنی کامل مشابہت تھی کہ دور سے کوئی کہہ نہیں سکتا کہ یہ پلاسٹک کے بنے ہوئے ہیں ——— صحرائی ملکوں میں سبزہ کی کمی نے پلاسٹک انڈسٹری کے لئے تجارت کا ایک نیا میدان کھول دیا ہے۔

ہندستان کے تقریباً پچاس ہزار افراد لیبیا میں کام کرتے ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگ جو طرابلس میں رہتے ہیں ان سے چند ملاقاتیں ہوئیں، پردیس میں اپنے ہم وطنوں سے ملنا ہمیشہ بہت خوشی کا باعث ہوتا ہے، جن سے میری ملاقاتیں ہوئیں وہ سب تعلیم یافتہ لوگ تھے۔ ان کے ساتھ چند شام گزری جو بہت دن تک یاد رہے گی۔ ان کے ایک اجتماع میں تقریر کرنے کا موقع ملا۔ میں نے اسلام کے دعوتی پہلو پر اپنے خیالات پیش کئے۔

کانفرنس میں شرکت کرنے والوں کو مختلف تحفے دئے گئے۔ ان میں سب سے زیادہ کارآمد چیز ایک جانماز تھا۔ اس جانماز میں ایک خاص قسم کا قطب نما چپکایا ہوا تھا جس کا نام کاشف الاتجاہات (Direction Finder) رکھا گیا ہے۔ یہ قطب نما دنیا کے کسی بھی مقام پر قبلہ کا رخ بتاتا ہے۔ اس میں گھڑی کی طرح چالیس اعداد چاروں طرف گولائی میں لکھے ہوئے ہیں اور سامنے ایک مینار بنا ہوا ہے۔ ہر عدد دنیا کے کسی خاص شہر کو بتاتا ہے۔ آپ جہاں کہیں ہوں، گائڈ بک میں اس مقام کا عدد دیکھیں اور پھر جانماز کو بچھا کر گھمائیں۔ قطب نما کی سوئی جب مطلوبہ نمبر پر ٹھہر جائے تو اس وقت مینار کا رخ جس جانب ہوگا وہی اس مقام پر قبلہ کا رخ ہوگا۔

طرابلس کی کانفرنس میں دنیا کے تمام حصوں کے لوگ ساڑھے چار سو کی تعداد میں آئے۔ مختلف ممالک سے تقریباً ۱۵۰ تنظیموں اور اداروں کی نمائندگی یہاں موجود تھی۔ دعوت دین اور احیاء اسلام کے عنوانات پر اس طرح کے اجتماعات مختلف مسلم ملکوں میں کثرت سے کئے جارہے ہیں۔ سعودی عرب خاص طور پر اس معاملہ میں کافی آگے ہے۔ وہ ساری دنیا میں بڑے پیمانہ پر اسلام کی خدمت کرنے والوں کی مدد کر رہا ہے۔ موجودہ مسلم حکمراں اگرچہ سیاسی اسلام کا نعرہ لگانے والوں کو برداشت نہیں کرتے۔ مگر دعوتی اسلام کی کوششوں کو وہ ہر طرح کا تعاون دینے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ ایسی حالت میں حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ ملے ہوئے مواقع کو استعمال کیا جائے نہ یہ کہ ہم اپنی جدوجہد کو اس میدان سے شروع کرنا چاہیں جو ابھی ہم کو حاصل نہیں ہوا۔

۹ راگست کو راقم الحروف کے اعزاز میں فندق باب المدینہ میں ایک عشائیہ دیا گیا۔ اس عشائیہ میں وزراء اور سفراء شریک تھے، طرابلس میں ہندستان کے سفیر مسٹر ارجن اسرانی نے بھی شرکت کی۔ اس قسم کی تقریب شرکا، موتمر میں راقم الحروف کے سوا اور کسی کے لئے منعقد نہیں کی گئی۔ دوسرے معززین کے علاوہ ڈاکٹر طاہر محمد الشویھدی (الامین العام للهیئة المشترکہ لتاسیس المراکز الثقافیہ الاسلامیہ) بھی اس موقع پر موجود تھے۔

طرابلس کا سوق الجمع (سپر بازار) دیکھا۔ اس طرح کے یہاں چار بازار ہیں، نئی دہلی کے سپر بازار کے مقابلہ میں یہاں کے سوق الجمع کی عمارت کافی زیادہ شاندار تھی۔ کئی منزلہ عمارت میں خودکار سیڑھیوں کا نہایت عمدہ انتظام تھا۔ حساب کتاب کرنے کے لئے جدید طرز کی درآمد شدہ مشینیں لگی ہوئی تھیں۔ تاہم خریداری اور سامان کے اعتبار سے وہ نئی دہلی کے سپر بازار سے کم نظر آیا، اس فرق کے ساتھ کہ دہلی میں تمام سامان ملکی ہوتا ہے اور یہاں تمام سامان باہر سے درآمد کیا ہوا۔

طرابلس کا متحف (میوزیم) کافی بڑا ہے۔ مگر وہ ترکوں کے ایک قدیم قلعہ میں قائم کیا گیا ہے اس لئے عمارتی اعتبار سے اس میں وہ خوبیاں نہیں ہیں جو اس عمارت میں ہوتی ہیں جو خاص طور پر میوزیم کے مقصد سے بنائی گئی ہو۔ مثال کے طور پر لکھنؤ کا میوزیم مقابلۃً کافی چھوٹا ہونے کے باوجود عمارتی اعتبار سے طرابلس کے میوزیم سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔

ایک ہندستانی عالم کے ساتھ عرب دنیا میں بعض اوقات یہ صورت حال پیش آتی ہے کہ وہ بظاہر عربی بولتا ہے مگر عرب اس کو سمجھ نہیں پاتے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ عربی لفظ کو اس کے اردو مفہوم میں استعمال کرتا ہے۔ اگرچہ عربی زبان کے بہت سے الفاظ اردو زبان میں رائج ہیں۔ اس لحاظ سے اردودانی کو عربی دانی کے لئے کارآمد ہونا چاہئے۔ مگر عملاً ایسا نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عربی کے اکثر الفاظ کے معنی اردو میں آکر بدل گئے ہیں۔

مثلاً اردو میں جس چیز کو ہم انقلاب کہتے ہیں، اس کے لئے عربی میں ثورہ کا لفظ ہے۔ عربی زبان میں ثورہ کے معنی ریوولیوشن کے ہیں اس کے مقابلہ میں انقلاب کا لفظ اس مفہوم کے لئے استعمال ہوتا ہے جس کو انگریزی میں (Coup) کہتے ہیں۔ ہندستان کے ایک مصنف نے اپنی کتاب کا نام الاقدار الاسلامیہ رکھا ہے۔ اس سے ان کی مراد اسلامک ویلوز ہے۔ مگر ویلو (Value) کے لئے عربی میں قیمت کا لفظ استعمال ہوتا ہے نہ کہ قدر کا۔ اگرچہ قیمت اور قدر دونوں ہی عربی الفاظ ہیں۔ تاہم عربی میں اس کو القیم الاسلامیہ کہیں گے نہ کہ الاقدار الاسلامیہ۔ وہ چیز جس کو اردو میں استحصال کہا جاتا ہے اس کے لئے عربی میں استغلال کا

لفظ استعمال ہوتا ہے، وغیرہ۔

اس سلسلہ میں دوسری مشکل تلفظ کی ہے۔ مثلاً موجودہ عرب الکرق کا تلفظ گ سے کرتے ہیں۔ یعنی وہ اقول لک (میں آپ سے کہتا ہوں) کو اگل لک بولیں گے۔ اسی طرح مثلاً وہ الاستقلال (آزادی) کو اس طرح بولتے ہیں کہ وہ الاستغلال سنائی دیتا ہے۔ چنانچہ اکثر ایسی صورت پیش آتی ہے کہ ہندستان کا ایک آدمی کسی لفظ کے معنی جانتے ہوئے عربوں کی گفتگو کو پوری طرح سمجھنے سے قاصر رہتا ہے۔ کبھی لفظ کے دہرے مفہوم کی وجہ سے اور کبھی تلفظ کے فرق کی وجہ سے۔ اردو داں مسلمانوں کی انفرادیت پسندی کی یہ عجیب قیمت ہے جو ان کو خود مسلم دنیا میں دینی پڑتی ہے۔

۲۷ اگست کو لیبیا میں ہندستان کے سفیر مسٹر ارجن اسرانی سے ملاقات ہوئی۔ نہایت ذہین اور با اخلاق آدمی ہیں۔ بہت شریفانہ طور پر ملے اور اس کے بعد مزید تفصیلی ملاقات کی غرض سے ۲۹ اگست کو باصرار اپنے گھر پر کھانے کی دعوت کی۔ کھانے کی میز پر سفیر صاحب کے ساتھ جناب عبدالخالق دہلوی بھی تھے۔ تقریباً ایک گھنٹہ تک دل چسپ اور مفید گفتگو رہی۔ سفیر صاحب نے اسلامیات کے مطالعہ کی خواہش ظاہر کی۔ چنانچہ میں نے چند پمفلٹ ان کی خدمت میں پیش کئے۔

اس سفر میں میری ملاقات ایک تعلیم یافتہ عرب سے ہوئی۔ وہ ایک ملک میں اچھے عہدہ پر ہیں۔ ان کو میں جانتا تھا۔ مگر مجھ کو یہ معلوم نہ تھا کہ وہ ہمارے مشن سے کس حد تک قریب ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ میری عربی کتابیں انھوں نے بار بار پڑھی ہیں۔ اس کے علاوہ کئی اردو کتابوں اور الرسالہ کے بہت سے مضامین کو ہندستانی یا پاکستانی عربی دانوں کے ذریعہ ترجمہ کرا کر سمجھا ہے۔ اب وہ ہمارے مشن کو پوری طرح پا گئے ہیں اور صدقی صدا اس سے متفق ہیں۔

مذکورہ عرب بزرگ نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کے ملک میں لوگوں کا معاملہ آپ کے ساتھ کیا ہے۔ میں نے کچھ تفصیلات بتاتے ہوئے کہا کہ ایک طبقہ ہمارا سخت مخالف ہو گیا ہے۔ حتیٰ کہ وہ اس پر تل گیا ہے کہ ہماری جڑ اکھاڑ کر اس مشن کا خاتمہ کر دے۔ یہ لوگ ہمارے خلاف جھوٹے مقدمات قائم کر رہے ہیں۔ ہماری معاشیات کو برباد کرنے کی تدبیریں کرتے ہیں۔ ہم کو اتنا زیادہ پریشان کرنا چاہتے ہیں کہ ہم تنگ آ کر اس مشن کو چھوڑ دیں۔

یہ سن کر عرب بزرگ بولے ——— آپ کا یہ اسلامی مشن بالآخر ایک تاریخ بننے والا ہے۔ پھر آئندہ بننے والی تاریخ میں یہ لوگ اپنا نام آخر کس خانہ میں لکھوانا چاہتے ہیں۔

دعاء

دعا کا تصور عام لوگوں کے ذہن میں تقریباً وہی ہے جو عاملین کے یہاں پر اسرار کلمات کا ہوتا ہے۔ عامل یہ سمجھتے ہیں کہ فلاں فلاں الفاظ کسی خاص ترتیب یا خاص تعداد میں زبان سے ادا کر دئے جائیں تو اس کا لازمی نتیجہ فلاں صورت میں برآمد ہوگا۔ اسی طرح لوگوں کا خیال ہے کہ دعا الفاظ کے کسی مجموعہ کا نام ہے جس میں خاص تاثیرات چھپی ہوئی ہیں۔ اگر آدمی دعا کے ان الفاظ کو صحیح تلفظ کے ساتھ ادا کر دے تو اس کے نتیجہ میں وہ تمام تاثیرات لازماً ظاہر ہونا شروع ہو جائیں گی۔

مگر یہ خیال صحیح نہیں۔ دعا اپنی حقیقت کے اعتبار سے کسی خاص قسم کے لفظی مجموعہ کا نام نہیں ہے بلکہ ان کیفیات کا نام ہے جو احساس احتیاج کے تحت آدمی کے اندر پیدا ہوتی ہیں اور پھر لفظوں کی صورت میں ڈھل جاتی ہیں۔

قرآن میں بہت سے انبیاء اور صلحاء کی دعائیں مذکور ہیں (مثلاً حضرت موسیٰ کی دعا، اصحاب کہف کی دعا، امرأۃ فرعون کی دعا) یہ ثابت ہے کہ ان لوگوں کی زبان عربی نہیں تھی۔ انبیاء کے متعلق قرآن میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ وہ مختلف علاقوں میں آئے اور وہ جہاں آئے وہیں کی مقامی زبان میں کلام کرتے تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان کی دعا ان کی اپنی مادری زبان (مقامی زبان) میں ہوتی تھی نہ کہ عربی زبان میں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن میں ان کی دعا صرف معناً مذکور ہے نہ کہ لفظاً۔

اسی طرح حدیث میں بہت سے انبیاء کی دعائیں مذکور ہیں۔ مثلاً حضرت عیسیٰ کی یہ دعا جو انھوں نے اپنے ایک شاگرد کو سکھائی:

اللّٰھم فارجَ الھم وکاشفَ الغم ومجیبَ دعوۃَ المضطرین رحمٰن الدنیا والآخرۃ رحیمَھُما انت ترحَمُنی فارحمنی برحمۃٍ تُغنِنی بھا عن رحمۃ مَن سواکَ (رواہ البزار والحاکم والاصبھانی)

اے غم کو دور کرنے والے اور مجبور کی پکار کو سننے والے، دنیا اور آخرت کے رحمان اور رحیم، تو ہی مجھ پر رحم کرتا ہے۔ مجھ پر ایسی رحمت کر جس کے بعد میں تیرے سوا دوسرے کی رحمت سے بے نیاز ہو جاؤں۔

ظاہر ہے کہ حضرت مسیح کی زبان عربی نہیں تھی اس لئے یقینی طور پر یہ دعا انھوں نے اس زبان میں بتائی جو ان کی اور حواریوں کی پیدائشی زبان تھی۔ حدیث میں یہ دعا اگرچہ عربی زبان میں نقل ہوئی ہے مگر یہ نقل بالمعنی ہے نہ کہ نقل بالالفاظ۔

اسباق سیرت

قرآن میں اہلِ ایمان کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے :

لقد کان لکم فی رسول اللّٰہ اسوۃ حسنۃ لمن کان یرجوا اللّٰہ والیوم الآخر و ذکر اللّٰہ کثیرا (الاحزاب ۲۱)

تمھارے لئے اللہ کے رسول میں بہترین نمونہ ہے، ہر اس شخص کے لئے جو اللہ کا اور آخرت کے دن کا امیدوار ہو اور اللہ کو بہت زیادہ یاد کرے۔

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہر انسان کے لئے مکمل نمونہ ہے۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ یہ نمونہ صرف اس شخص کے لئے ہے جو اللہ کو بہت زیادہ یاد کرنے والا ہو، جو اللہ اور آخرت کا امیدوار بن چکا ہو۔

گویا رسول کی زندگی کا نمونہ، پوری طرح موجود ہونے کے باوجود، اپنے آپ ہر آدمی کے لئے نمونہ نہیں بن جائے گا۔ وہ صرف اس بندۂ خدا کے لئے نمونہ بنے گا جس نے اللہ کو اتنی گہرائی کے ساتھ پایا ہو کہ وہ اس کی یادوں میں سما جائے۔ اللہ جس کی تمناؤں کا سرمایہ بن چکا ہو۔ جس کا حال یہ ہو کہ وہ اللہ کے عذاب سے ڈرنے لگے اور آخرت کا انعام جس کی نظر میں اتنا اہم بن جائے کہ وہ دل وجان سے اس کا آرزو مند ہو۔

رسول کے اسوۂ حسنہ کو پانے کے لئے یہ شرط کیوں لگائی گئی، اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی حقیقت کے ادراک کے لئے اس کے بارے میں سنجیدہ ہونا شرط لازم ہے۔ خدا اور آخرت سے مذکورہ قسم کا تعلق ہونا آدمی کو خدا اور آخرت کی باتوں میں سنجیدہ بناتا ہے۔ یہی سنجیدگی اس بات کی ضمانت ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ کو صحیح نظر سے دیکھے اور اس سے مطلوبہ سبق لے سکے۔

اس مسئلہ کی وضاحت کے لئے ایک مثال لیجئے۔ حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

من قتل دون مالہ فھو شھید۔ ومن قتل دون دمہ فھو شھید ومن قتل دون دینہ

جو شخص اپنے مال کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے۔ جو شخص اپنے خون کی حفاظت میں مارا جائے

فہو شہید۔ ومن قتل دون اہلہ فہو شہید (ترمذی، نسائی، ابوداؤد)

وہ شہید ہے۔ جو شخص اپنے دین کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے۔ جو شخص اپنے گھروالوں کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے۔

جیسا کہ الفاظ سے ظاہر ہے، یہ حدیث "لڑنے" کے بارے میں نہیں ہے بلکہ "مارے جانے" کی صورت میں مومن کے انجام کو بتانے سے متعلق ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد یہ نہیں ہے کہ جب بھی کہیں کوئی مال یا خون یا دین یا اہل وعیال کا مسئلہ پیش آئے، تم فوراً لڑ جاؤ، خواہ اس کے نتیجہ میں یہی کیوں نہ ہو کہ تم قتل کر دئے جاؤ۔ بلکہ اصل مطلب یہ ہے کہ اگر کبھی ایسا ہو کہ مذکورہ اسباب سے کوئی شخص مومن کو قتل کر دے تو اس کا قتل قتل نہیں بلکہ شہادت ہوگا۔ گویا یہ حدیث اصلاً لڑائی پر اکسانے کے لئے نہیں ہے بلکہ قتل کر دئے جانے کی صورت میں شہادت کا درجہ پانے سے متعلق ہے۔

اب جو شخص دین کے بارے میں سنجیدہ نہ ہو، جس کو اپنے ذاتی ذوق کے لئے رسول اللہ کا جواز مطلوب ہو وہ بس حدیث کے الفاظ کو لے لے گا اور اپنے نفسانی جھگڑوں اور قومی لڑائیوں کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے اس کو بطور دلیل پیش کرے گا۔ وہ کہے گا کہ اسلام آدمی کو مردانگی کی تعلیم دیتا ہے، وہ کہتا ہے کہ اپنے دین وایمان، جان ومال، زمین وجائداد، بیوی بچوں اور خویش واقارب کی حفاظت کے لئے لڑ جاؤ۔ اگر تم جیت گئے تو تم نے اپنا مقصد پالیا۔ اگر تم ہار گئے تو تم شہید ہوئے۔ اور شہادت وہ رتبہ بلند ہے جو خوش قسمت انسانوں ہی کو ملتا ہے۔

مگر جو آدمی اللہ سے ڈرتا ہو وہ اس کو نہایت سنجیدہ ہو کر دیکھے گا۔ اس کی سنجیدگی اس کو اس سوال تک پہنچائے گی کہ جب مال اور خون اور دین اور خاندان کے دفاع میں لڑنا مرنا مطلوب ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اس قسم کی برعکس مثالیں کیوں ہیں کہ آپ بہت سے مواقع پر صریح ظلم کے باوجود صبر کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی صبر کی تلقین کرتے ہیں۔

۱۔ مثال کے طور پر ابن ہشام نے ابوعثمان النہدی کے حوالہ سے یہ واقعہ نقل کیا ہے:

بلغنی ان صہیباً حین اراد الہجرۃ قال لہ کفار قریش اتیتنا صعلوکاً حقیراً فکثر مالک عندنا وبلغت الذی بلغت ثم ترید ان تخرج بمالک ونفسک، واللہ لایکون ذلک۔ فقال

مجھ کو یہ بات پہنچی ہے کہ حضرت صہیب نے جب مکہ سے ہجرت کا ارادہ کیا تو کفار قریش نے ان سے کہا کہ تم ہمارے یہاں آئے تو بالکل غریب تھے۔ پھر تمہارے پاس یہاں بہت مال ہوگیا اور تم اس درجہ کو

لهم صهيب ارأيتم ان جعلتُ لكم مالی اتخلون سبیلی۔ قالوا نعم۔ قال فانی جعلت لکم مالی۔ قال فبلغ ذلک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال ربح صهیب ربح صهیب۔
(سیرۃ النبی لابن ہشام، الجزء الثانی، صفحہ ۸۹)

پہنچے جس درجہ میں تم اب ہو۔ تم چاہتے ہو کہ اپنے جان و مال کے ساتھ یہاں سے چلے جاؤ تو خدا کی قسم ایسا کبھی نہیں ہو گا۔ حضرت صہیب نے ان سے کہا، اگر میں اپنا مال تمھارے حوالے کر دوں تو تم مجھ کو جانے دو گے۔ انھوں نے کہا، ہاں۔ حضرت صہیب نے کہا پھر میں نے اپنا مال تمھارے حوالے کیا۔ راوی کہتے ہیں کہ یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی تو آپ نے فرمایا: صہیب کی تجارت کامیاب رہی، صہیب کی تجارت کامیاب رہی۔

مذکورہ حدیث میں مال کے مقابلہ میں لڑ کر جان دینا اگر مطلق معنوں میں ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چاہیے تھا کہ حضرت صہیب کو ناکامی کا الزام دیں نہ کہ انھیں کامیابی کا کریڈٹ عطا فرمائیں۔

۲۔ ہجرت کے چھٹے سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عمرہ کے ارادہ سے مدینہ سے روانہ ہوئے۔ مکہ کے قریب حدیبیہ کے مقام پر پہنچے تو قریش نے آگے بڑھ کر روکا۔ اس موقع پر فریقین کے درمیان صلح کی گفت وشنید ہو رہی تھی کہ وہاں ابوجندل بن سہیل آ گئے۔ انھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اس کی وجہ سے مکہ والے ان کو سخت تکلیفیں دے رہے تھے اور ان کے پیروں میں لوہے کی زنجیریں ڈال دی تھیں۔ انھوں نے جب سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب حدیبیہ میں ہیں تو وہ کسی طرح بھاگ کر مکہ سے حدیبیہ پہنچے۔ اس وقت بھی ان کے پیروں میں بیڑیاں تھیں اور ان کا جسم خون آلود ہو رہا تھا۔ ان کو دیکھ کر قریش کے سردار سہیل بن عمرو (ابوجندل کے والد) نے کہا کہ ابوجندل کو ہمیں واپس کرو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب نے بہت چاہا کہ انھیں دوبارہ مکہ نہ بھیجا جائے۔ مگر سہیل بن عمرو نے کہا کہ اگر آپ نے ابوجندل کو ہمارے حوالے نہ کیا تو ہم آپ سے کسی طرح کی کوئی صلح نہیں کریں گے۔

یہ بڑا جذباتی لمحہ تھا۔ ابوجندل بیڑیوں میں خون آلود سامنے کھڑے تھے۔ انھوں نے کہا: اے مسلمانو، کیا میں مشرکین کی طرف لوٹا دیا جاؤں گا، حالانکہ میں اسلام قبول کر چکا ہوں۔ کیا تم لوگ دیکھتے نہیں کہ ان لوگوں نے مجھے کس قدر عذاب پہنچایا ہے۔ اس کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مکہ کی طرف لوٹا دیا اور ان سے کہا:

یا اباجندل اصبر واحتسب فان اللہ جاعل لك ولمن معك من المستضعفین فرجا ومخرجا

اے ابوجندل، صبر کرو، اللہ تمھارے لئے اور دوسرے کمزور مسلمانوں کے لئے گنجائش پیدا کرے گا۔

(سیرۃ النبی لابن ہشام۔الجزء الثالث، صفحہ ۳۶۷)

مذکورہ حدیث میں لڑنا اور شہید ہوجانا اگر مطلق معنوں میں ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس موقع پر حضرت ابوجندل کو صبر و رضا کی نصیحت نہ فرماتے۔ بلکہ انھیں شہادت کا راستہ بتاتے اور خود بھی اپنے اصحاب سمیت قریش سے لڑ جاتے۔

۳۔ اسی حدیبیہ کا واقعہ ہے کہ قریش نے آپ کو روکا اور کہا کہ ہم اس سال آپ کو عمرہ کے لئے مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ آپ اس پر راضی ہوکر واپس مدینہ چلے آئے۔ اور عمرہ کے لئے مکہ جانے پر اصرار نہیں کیا۔ حالانکہ یہ خالص دینی معاملہ تھا اور آپ خدائی بشارت کی بنیاد پر اپنے اصحاب کو لے کر زیارت حرم کے لئے جارہے تھے۔ اگر مذکورہ حدیث میں دین کے لئے لڑکر شہید ہونا مطلق معنوں میں ہو تو آپ کو چاہئے تھا کہ اسی سال عمرہ کرنے کے لئے اصرار کریں، خواہ اس کے نتیجہ میں عمرہ ملے یا شہادت۔

۴۔ مکہ میں عمار بن یاسر اور ان کے والدین بنو مخزوم کے غلام تھے۔ یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاکر اسلام میں داخل ہوگئے۔ بنو مخزوم کو ان کا اسلام لانا سخت ناپسند تھا۔ چنانچہ وہ ان کو عین دوپہر کے وقت صحرا میں لے جاتے اور تپتی ہوئی ریت پر لٹا کر انھیں سخت عذاب دیتے۔ حتیٰ کہ عمار کی والدہ کو انھوں نے قتل کر دیا۔ ابن ہشام اس واقعہ کو نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

فیمر بھم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فیقول فیما بلغنی: صبرًا آل یاسر موعدکم الجنۃ (الجزء الاول صفحہ ۳۴۲)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس سے گزرتے اور جیسا کہ مجھے روایت پہنچی ہے ان سے کہتے: اے خاندان یاسر، صبر کرو، تمھارے لئے جنت کا وعدہ ہے۔

مذکورہ حدیث اگر مطلق معنوں میں ہو تو ایسا کہنا، نعوذ باللہ، بزدلی کی تعلیم دینا ہوگا۔ پھر تو آپ کو آل یاسر سے کہنا چاہئے تھا کہ تم لوگ لڑکر شہید ہوجاؤ اور خود بھی اس مقدس جنگ میں ان کے ساتھ شریک ہوجاتے۔ خواہ آل یاسر کو بچا سکیں یا اسی راہ میں شہادت کا درجہ حاصل کرلیں۔

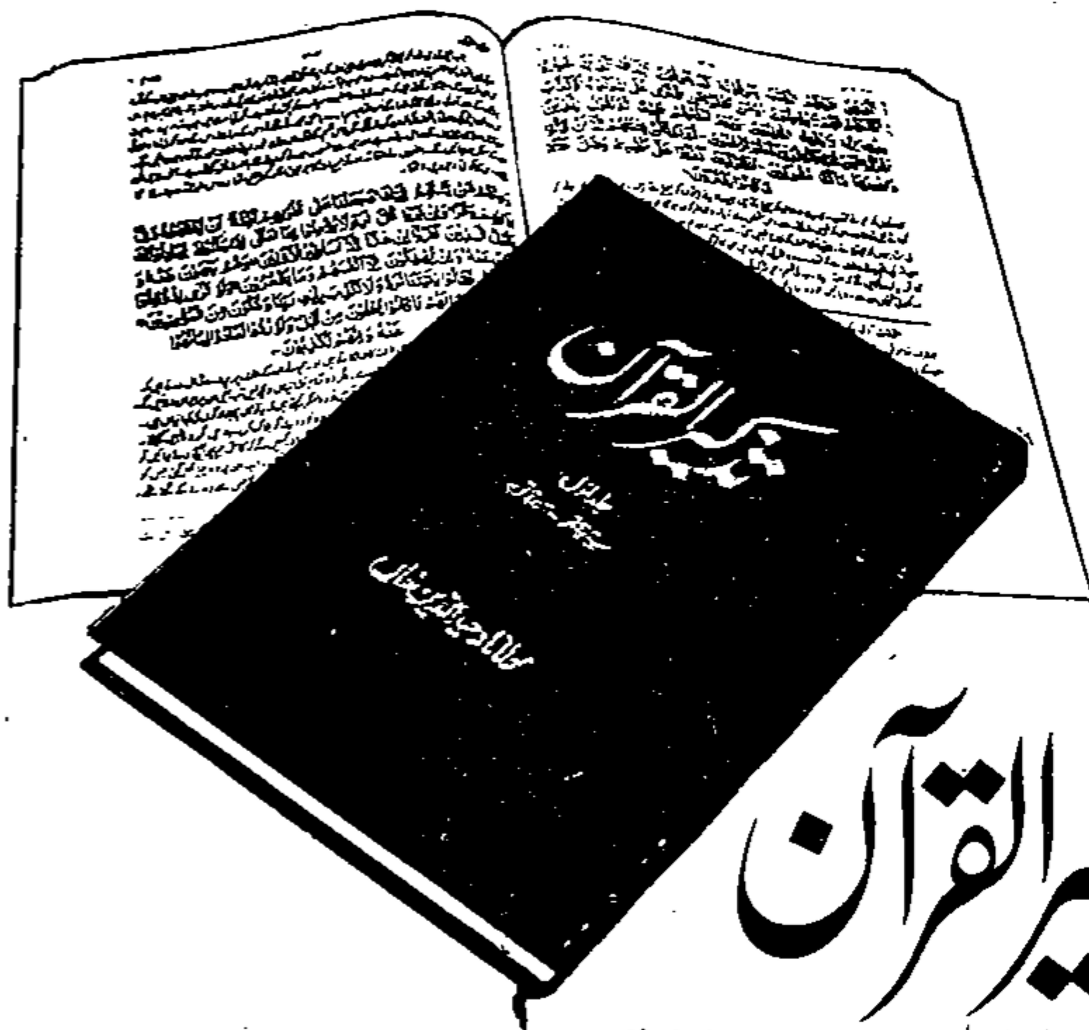
حقیقت یہ ہے کہ اسوۂ رسول ان چیزوں میں سے ہے جن کی ایک سے زیادہ تعبیر ممکن ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسوۂ رسول کے معاملہ میں آدمی ہمیشہ صحیح تعبیر اور غلط تعبیر کے درمیان رہتا ہے۔ اور جو چیز کسی کو غلط تعبیر سے بچاتی ہے وہ صرف ایک ہے۔ یہ کہ خوف خدا نے آدمی کو حقیقت پسندی کی اُس سطح پر پہنچا رکھا ہو جس کو سنجیدگی کہا جاتا ہے۔

آدمی اگر فی الواقع سنجیدہ ہو تو اس کی سنجیدگی اس کو اسوۂ رسول کے بارے میں مذکورہ سوالات سے دوچار کرے گی۔ اس کو چونکہ صرف مفید مطلب بات نہیں لینی تھی بلکہ یہ معلوم کرنا تھا کہ حقیقی طور پر اسوۂ نبوت کیا ہے۔ اس کا یہ ذہن اس کو غلط تعبیر سے بچائے گا۔ وہ بے آمیز ذہن کے تحت اس مسئلہ پر غور کرے گا اور خدا کی توفیق سے بات کی تہ تک پہنچ جائے گا۔ اب اس کو معلوم ہوگا کہ اس کا راز ہے ——— بڑے فائدہ کی خاطر چھوٹے نقصان کو برداشت کرنا۔

اہل ایمان کے لئے سب سے اہم چیز دعوتی مصلحت ہے نہ کہ شخصی مصلحت۔ اگر دعوتی مصلحت اور شخصی مصلحت میں ٹکراؤ ہو تو شخصی مصلحت کو قربان کرکے دعوتی مصلحت کو حاصل کیا جائے گا۔ مذکورہ واقعات میں رسول کی طرف سے صبر کی تلقین کی وجہ یہی دعوتی مصلحت ہے۔ دعوتی کام کو مؤثر طور پر جاری رکھنے کے لئے خدا کے رسول نے جان، مال اور خاندان کی قربانیاں برداشت کیں۔ حتیٰ کہ دشمنوں کی طرف سے "دین میں مداخلت" کو بھی وقتی طور پر گوارا کرلیا۔ تاکہ دعوت کا کام جاری رہے جو اہل ایمان کے لئے ہر قسم کی کامیابیوں کا واحد ذریعہ ہے۔

جب آدمی کے سامنے کوئی مقصد ہو تو وہ مقصد کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ وہ دوسرے تمام نقصانات کو نظر انداز کرتا رہتا ہے تاکہ اصل مقصد ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ اور جب کوئی مقصد سامنے نہ رہے تو وہ ہر چیز میں الجھتا ہے۔ وہ ہر بات کے لئے دوسروں سے لڑتا ہے۔ خواہ اس کے نتیجہ میں یہی کیوں نہ ہو کہ چھوٹے نقصان کو برداشت نہ کرنے کی بنا پر اس کو زیادہ بڑا نقصان برداشت کرنا پڑے ——— داعی اس دنیا کا سب سے زیادہ بامقصد انسان ہے، اس لئے وہ ہمیشہ پہلے رویہ کو اختیار کرتا ہے نہ کہ دوسرے رویہ کو۔ اس کلیہ سے مستثنیٰ صرف وہ امور ہیں جب کہ معاملہ خالص دفاعی ہو، اس کا دعوتی مقصد سے کوئی تعلق نہ ہو۔

اس تمہید کے بعد یہاں ہم مختلف پہلوؤں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ واقعات نقل کرتے ہیں جن میں ہماری زندگی کے لئے زبردست سبق اور نصیحت موجود ہے۔



تذکیر القرآن

جلد اوّل
سورۃ فاتحہ ۔ سورۃ توبہ

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی تفصیلات اور غیر متعلق معلومات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام و خواص دونوں کے لئے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبین قرآن کے لئے فہم قرآن کی کنجی ہے۔

ھدیہ مجلد: پچاس روپے

ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ سے شائع کیا

Regd. R.N. No. 28822/76
Regd. D(DN) No. 532

January 1983
Issue No., 74

AL-RISALA MONTHLY
Jamiat Building, Qasimjan Street, Delhi - 110 006 (India)
Telephone : 232231, 526851